قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل الاشتراک
سالانہ
پاکستان —— ۴۸ روپے
غیر ممالک —— ۱۱۰ روپے

ٹیلیفون
87 92 46
خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
۴
چار روپے

نمبر ۱

جنوری سنہ ۱۹۸۸ء

جلد (۴۱)

فہرست

۱۔ لمعات ۲
۲۔ مقامِ محمدیؐ۔ (محترم پرویزؒ صاحب) ۷
۳۔ کیا تمام مذاہب یکساں ہیں۔ (محترم پرویزؒ صاحب) ۳۲
۴۔ عمر اور زندگی (محترمہ ثریا عندلیب)
۵۔ حقائق و عبر
(i) سیرت النبیؐ اور پیٹ کا مسئلہ
(ii) خطبۂ حجۃ الوداع
(iii) فرقۂ اہلِ حدیث اور مسئلہ قربانی
(iv) علماءِ اہلِ حدیث کی حق پرستی
(v) نابالغ کا نکاح
(vi) بلا تبصرہ ۵۵
(vii) کتاب و سنّت
(viii) حضرت اور اعلیٰ حضرت ۵۹

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالمجید۔ مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ: النور پرنٹرز، ۲/۴ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۲۵۔

لمعات

روزنامہ "جنگ"، لاہور مورخہ ۲ نومبر ۱۹۸۷ء، صفحہ آخر، کالم ۶ تا ۷، میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ:-

"برطانیہ میں قائم عرب سٹریٹجک سٹڈیز کی حالیہ رپورٹ کے مطابق اسرائیل کی ایٹمی صلاحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے عرب ممالک کو چاہیئے کہ ایٹم بم تیار کریں۔ اس بات کا انکشاف کویت کے ایک اخبار نے کیا ہے۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ عرب ممالک کے ایٹم سے مشرقِ وسطیٰ میں امن قائم ہو جائے گا اور پھر عرب ممالک کو یورینیم ۲۳۵ کی سہولت بھی حاصل ہے۔"

متذکرہ بالا رپورٹ سے کچھ اس قسم کا تأثر ملتا ہے۔ جیسے اسرائیل صرف عرب ممالک ہی کا دشمن ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل صرف عربوں ہی کا دشمن نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا دشمن ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ اس وقت "وہ عالمِ اسلام"، جو قرآنی اقدار و قوانین پر عمل پیرا ہونے سے تشکیل پاتا ہے، کہیں موجود نہیں۔ یعنی جسے ملّت کہا جاتا ہے۔ ملّت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ غیر منقسم وحدت (INTEGRATED WHOLE) ——— (INDIVISIBLE UNIT) ہوتی ہے۔ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲۱/۹۲، ۲۳/۵۲) ملّت کی تعمیر کے لیئے علاقائی عصبیتوں کے بتوں کو توڑنا ہوگا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا — نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی

اس طرح کے اینٹ اور گارے سے جس جسدِ ملّت کی تعمیر ہوگی وہ ایسی قوّت سے لیس ہوگا جو انسان کی بنائی ہوئی تابکار قوتوں سے کہیں زیادہ طاقتور قوت ہوگی۔ ارشادِ الٰہی ہے کہ:-

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (۵۹/۲۱)

اگر ہم اس قرآن کو قلب پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ پہاڑ اس کے دبدبہ و جبروت سے شق ہو کر ریزہ ریزہ ہو جاتا۔

اگرچہ قرآنِ حکیم کا تعلق انسانی راہنمائی سے ہے، تاہم بات سمجھانے کی خاطر ایسا کہا گیا کہ قرآن کے اِتباع سے وہ انقلاب رُونما ہوتا ہے جو باطل قوتوں کو نیست و نابود کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس طرح اُس مومن کی کیا کیفیت ہوگی جس نے (مثلاً) اس تابکار قوت کو اپنے سینے میں محفوظ کر رکھا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آگیا، جو بیان کئے بغیر آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ اس واقعہ کا تعلق علامہ اقبالؒ اور آنجہانی مسولینی کی ایک ملاقات سے ہے۔ یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب مسولینی کا خوب طوطی بول رہا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے دورانِ گفتگو مسولینی سے دریافت کیا۔ کہ آپ کی کامیابی اور فتوحات کا راز کیا ہے؟ مسولینی نے جواب دیا کہ یہ سیدھی سادھی بات ہے۔ "HE, WHO HAS STEEL HAS EVERY THING" یعنی جس کے پاس سامانِ حرب بافراط ہے۔ وہ کامیاب و کامران ہے۔ لیکن علامہ اقبالؒ، جو قرآن کے طالب علم تھے، کہنے لگے نہیں مسولینی آپ غلطی پر ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ "HE, WHO IS STEEL, HAS EVERYTHING" اس حقیقت کو علامہؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

اس حقیقت کی تاریخ ساز مثال آپ کو معرکۂ بدر اور مبارزتِ اندلس میں ملے گی۔ جہاں اقلیت و اکثریت پر غالب آئی۔ یہ کیا تھا؟ یہ صحیح جذبۂ ایمانی اور اس کے نتیجے میں بدلی ہوئی اقدارِ زندگی کا معجزہ تھا۔ اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹)، اگر تم مومن ہو تو یقیناً غالب رہو گے اوّلاً یہ جذبۂ ایمانی قرآن کے اِتّباع سے پیدا ہوتا ہے اور ثانیاً وحدت و اشتراک کی زندگی سے جو عکاس ہوتی ہے ملّت کی۔ افراد ہوں یا گروہ اُن کی زندگی کا راز وحدت و اشتراک میں مضمر ہے یعنی ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے، تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور، بیرونِ دریا کچھ نہیں!

اس کے لئے ایک محسوس و مشہود مرکزِ توحید کی ضرورت ہوتی ہے (کیونکہ اس کے بغیر اجتماعیت اور ملّت کا تصور اُجاگر نہیں ہوتا) جو ضامن ہے حیاتِ جاوداں اور نصرتِ خداوندی کا، کیونکہ ؎

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے، خدائی!

اس وقت مسلمان، مشمولہ عرب ممالک، جس زبوں حالی کی کیفیت سے دوچار ہیں اس کی اوّلیں وجہ یہ ہے کہ وہ وحدت و اشتراک کی زندگی کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ جس کا بنیادی سبب وہ غیر خُداوندی نظریہ اور نظام ہے جسے وہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ قرآنِ حکیم کے مطابق یہ نکبت و زبوں حالی کی زندگی میں ملبوس ہیں۔ علامہ اقبالؒ موجودہ مسلمان کا قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں سے موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ؎

وہ معزز تھے زمانے میں مسلمان ہو کر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

کوئی قوم خدا کے عذاب میں اُس وقت مبتلا ہوتی ہے، جب وہ قوم اقدارِ الٰہی (قانونِ خداوندی) کو دانستہ یا نادانستہ چھوڑ کر ان کے خلاف نظام قائم کر لیتی ہے اس طرح عذاب کی اوّلیں شکل یہ ہوتی ہے کہ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ط (۶/۶۵)، اللہ (کا قانون یہ ہے کہ تمہارے اعمال کی

سزا کے طور پر وہ تمہیں) مختلف گروہوں اور فرقوں میں تقسیم کر دے جس سے تم آپس میں سر پھٹول شروع کر دو۔
دوسری قسم کا عذاب اس قسم کا ہوتا ہے کہ نافرمان قوموں کی بستیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں گویا وہ کٹے ہوئے کھیت اور بجھے ہوئے انگارے کی طرح ہو جاتی ہیں۔ (۲۱/۱۵) ان کی آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور اُن کے فلک بوس محلات پیوندِ زمین ہو جاتے ہیں اور اُن کے کنوئیں بیکار ہو جاتے ہیں (۲۲/۴۵) اور تاریخ کے صفحات پر فقط ان کی داستانیں باقی رہ جاتی ہیں (۲۳/۴۴)۔
تیسری قسم کے عذاب کی یہ شکل ہوتی ہے کہ وہ قوم کسی دوسری قوم کی محکوم و غلام ہو جاتی ہے (جسے استبدالِ اقوام کہا جاتا ہے ۴۷/۳۸) یہ عذاب پہلے کی نسبت کہیں مہیب اور رُسوا کن ہوتا ہے۔ اس سے قومیں اپنا تشخص کھو بیٹھتی ہیں۔ یہ کچھ یونہی فوری طور پر نہیں ہو جاتا۔ بلکہ قانونِ الٰہی کی نافرمانی کے اثرات آہستہ آہستہ مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے SLOW POISONING کا اثر یہ مضمر اثرات مکمل ہو کر عذاب کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔
قرآنِ حکیم کی رُو سے اگر کسی قوم پر کتاب اللہ کے سوا کسی اور قانون کی حکمرانی ہو تو وہ قوم محکوم ہی ہوتی ہے۔ خواہ وہ خود ہی حکمران کیوں نہ ہو۔ اس سے بڑھ کر غیرت و حمیت کا دیوالیہ پن کیا ہو سکتا ہے؟ اس اعتبار سے مسلمانوں کی تمام آزاد مملکتیں ہزار سال سے مسلسل محکوم کی محکوم چلی آ رہی ہیں کیونکہ آزادی صرف قوانینِ خداوندی کی محکومیت کا نام ہے۔
اقوام سے آگے بڑھیں تو پوری انسانیت سامنے آجاتی ہے۔ اگر انسان قانونِ الٰہی سے منہ پھیر لے تو پھر خدا بھی اُس کی حفاظت اور نشوونما سے دستکش ہو جاتا ہے۔ جس سے اُس کی ذات کی نشوونما رُک جاتی ہے۔ اسے فسق کہا جاتا ہے۔ اس طرح بالآخر اُن میں زندہ رہنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کے اُس قانون کے حرکت میں آجانے کا امکان ہے جس سے وہ ایسی مخلوق کو معدوم کر دے اور اس کی جگہ ایک نئی باصلاحیت مخلوق کو لے آئے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ ۙ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ (۱۴/۲۰-۱۹)

جس چیز میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں رہتی، وہ ختم ہو جاتی ہے اور اُس کی جگہ ایسی چیز لے لیتی ہے جس میں اس قسم کی صلاحیت ہوتی ہے۔ لہٰذا ان سے کہہ دو۔ کہ اگر تمہارے اعمال تعمیری نتائج پیدا نہیں کریں گے۔ تو تم کائناتی نقشہ میں فٹ نہیں بیٹھ سکو گے اور خدا کائناتی قانون تمہیں نکال باہر پھینکے گا اور تمہاری جگہ نئی مخلوق لے آئے گا۔ اور ایسا کرنا خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں!

اس سے ظاہر ہے کہ خدا کے لئے یہ بھی مشکل نہیں کہ اگر ساری کی ساری نوعِ انسانی غلط راہوں پر چل نکلے

قوم" کی جگہ ایک "نئی مخلوق" لے آئے۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا (۴/۱۳۳)

ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں کہ ہم موجودہ نوعِ انسان کو ختم کر دیں اور اس کی جگہ ایسی نوع کو لے آئیں جو باصلاحیت ہو گی۔

یہ ہے مآل نافرمان قوموں کا۔

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ اسرائیل کی ایٹمی صلاحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے عرب ممالک کو چاہیئے کہ وہ ایٹم بم تیار کریں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا یہی حل ہے؟ اگر عرب ممالک ایٹم بم تیار کر بھی لیں تو کیا اس طرح وہ انفرادی طور پر اس پر غالب آ سکتے ہیں؟ مانا کہ اسرائیل ایک چھوٹا سا ملک ہے لیکن اس نے اپنی فکر کے مطابق اپنے اندر ایسا جذبہ پیدا کر رکھا ہے کہ کوئی ملک، خواہ چھوٹا ہے خواہ بڑا، اس کے سامنے دم نہیں مار سکتا۔ مسلمانوں کے تقریباً چوالیس ممالک ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو اس ایک ملک کی دست برد سے محفوظ نہیں سمجھتے۔ ایسا کیوں ہے؟ ایسا اس لئے ہے کہ مسلمانوں کا دین کے تقاضوں کے مطابق نہ تو کوئی مرکز ہے اور نہ ہی ملت کا وجود۔ اگرچہ حضرت ابراہیمؑ نے اُمتِ مسلمہ کی تاسیس کے لیے مکہ میں توحید کا مرکز تعمیر کیا تھا، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اُسے هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳/۹۶) تمام اقوامِ عالم کے لیے راہنمائی کا نشان بنایا گیا — لیکن انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ مسلمانوں نے اس مرکز کو نہ تو اس حیثیت (STATUS) میں "ESTABLISH" کیا اور نہ ہی اسے اس نظریہ سے تسلیم (RECOGNIZE) کیا جس کے لیے اسے حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا۔ اس لامرکزیت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ممالک اُس مقصد کے لیے (غیروں کی) اقوامِ متحدہ (U.N.O) کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ جس مقصد کے لئے کعبہ تعمیر کیا گیا تھا اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو قبلہ مقرر کیا تھا۔ کہ ہر معاملہ میں اُس کی طرف رجوع کیا جائے۔ بالفاظِ دیگر اُس نظام کی طرف رجوع کیا جائے جس کا محسوس و مشہود مرکز (قبلہ) کعبہ ہے۔

تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ مسلمان محرومی اور زبوں حالی کے جس مرض میں مُبتلا ہیں، یہ وہی ہے جو آدم کو لاحق ہوا تھا۔ یعنی قانونِ الٰہی سے انحراف، اور علاج بھی اس کا وہی ہے جو آدم کو تجویز کیا گیا تھا کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸) یہ ہدایت آج بھی اپنی مکمل اور مُنزّہ صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس لئے ہم پستی سے اُبھر کر پھر اُسی بلندی پر پہنچ سکتے ہیں جہاں سے ہم گرے تھے۔ آدم کی لغزش ابلیس کی لغزش نہیں جس میں گر کر پھر اُبھرنا نہیں، ٹوٹ کر پھر بننا نہیں۔

آخر گنہگار ہیں کافر نہیں ہیں ہم!

جب ابدی مایوسی نہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے کھوئے ہوئے مقام کی بازیابی کی کیا

صورت ہے؟ جواب بالکل سہل اور سادہ ہے۔ ہماری نشأۃِ ثانیہ کے دو اجزأ لاینفک ہیں۔ ایک تمسّک بالقرآن اور دوسرے اجتماعی زندگی کے تخیّل کا احیاء۔ کیونکہ لَا اِسلَامَ اِلَّا بِالجَمَاعَۃ۔ قرآن تو ہمارے پاس موجود ہے۔ جہاں تک تشکیلِ جماعت کا تعلق ہے یہ اس وقت ممکن ہے جب دنیا کے مسلمان، گروہی اور علاقائی عصبیتوں کے بت توڑ کر جسدِ واحد کی طرح بصورتِ ملت، اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ ۳/۱۰۳ کے مصداق ایک دوسرے میں مدغم ہوجائیں کہ قومیں اوطان سے نہیں، تصوّرِ حیات سے بنتی ہیں۔ لہٰذا مختلف علاقوں اور خطوں میں رہتے ہوئے بھی مسلمانانِ عالم ایک قوم کے افراد ہیں۔ اِنَّ ھٰذِہٖۤ اُمَّتُکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً زملے اس لیے کہ ان سب کا خدا ایک ہے۔ وَاَنَا رَبُّکُمۡ .... ۲۱/۹۲۔

اگر آج بھی مسلمان اپنے معاملات قرآنِ حکیم کے تابع کرلیں اور ایک قوم بن کر منظرِ عام پر آئیں تو دنیا دیکھے گی کہ ایک ارب مسلمانوں کا سیلاب بے پناہ کس طرح باطل قوتوں (مشمولہ اسرائیل) کو خس وخاشاک کی طرح بہا کرلے جاتا ہے۔ اس طرح عرب ممالک کو نہ علیحدہ اسرائیل سے جنگ کرنا پڑے گی اور نہ ہی کسی ایٹم بم کی ضرورت ہوگی، یہ ملّتِ اسلامیہ اور اُس کے مرکز کا اجتماعی فریضہ ہوگا کہ وہ اسرائیل سے اپنا حساب چکائے اور باطل قوتوں کو راہِ راست پر لائے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق فرمائے۔

لیکن اور یہ لیکن اتنی ہی اہم ہے کہ اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے دفاعی تقاضوں سے غفلت برتیں اور دشمن کو منہ توڑ جواب دے سکنے کی قوّت اپنے اندر پیدا نہ کررکھیں۔ ہمیں ہر وقت ایسی مستحکم حالت میں رہنے کی تاکید کی گئی ہے جس سے ہمارے دشمنوں کو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوسکے۔ اِرشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَاَعِدُّوۡا لَھُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّۃٍ وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَیۡلِ تُرۡھِبُوۡنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمۡ ۸/۶۰

اور جہاں تک ہوسکے تم مستعد طاقت ور رسالے (گھوڑ سوار دستے) اور سامانِ حرب سے (اپنی سرحدوں کو) محفوظ رکھو تاکہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر تمہاری دھاک بیٹھی رہے (اور وہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ کریں۔

........o........

محترم پرویز صاحب

مقامِ محمدیؐ

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

برادرانِ عزیز!

آپ کو معلوم ہے کہ میری زندگی کا مشن پیامِ خداوندی کو عام کرنا ہے۔ لیکن پیامِ خداوندی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ تاوقتیکہ مقامِ محمدیؐ نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔ مقامِ محمدیؐ کہ جسے دوسرے لفظوں میں مقامِ نبوت کہا جائے گا۔ اور اے سرحدِ ادراک ہے یعنی وحی کا سرچشمہ وہ مقام ہے جو انسانی عقل سے آگے ہے۔ اس لیے نہ تو مقامِ محمدیؐ کا تعین عقل کی رو سے کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی عقل کی رُو سے اس کی کنہ وحقیقت اور کیفیت وماہیت تک پہنچا جاسکتا ہے یعنی یہ چیز عقل کے بس کی بات نہیں کہ یہ سمجھ سکے کہ وحی کی ماہیت کیا ہوتی ہے اور وہ نبی کو کس طرح ملتی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق جو کچھ سمجھا جاسکتا ہے اسے خدا ہی سمجھا سکتا ہے جو وحی کا سرچشمہ ہے۔ اس مقام کے متعلق یوں تو قرآن کے مختلف گوشوں میں منتشر طور پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن سورۂ والنجم کی ابتدائی آیات میں اسے اس حسنِ ایجاز و ارتکاز سے بیان کیا گیا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے ان چھوٹے چھوٹے موتیوں میں بڑے بڑے اہم حقائق اس طرح سموئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ ان آیات کے متعلق میں نے اس سے پہلے (سلیم کے نام ایک خط میں) بھی لکھا تھا لیکن آج کی نشست میں انہیں ذرا تفصیل سے سامنے لایا جائے گا تاکہ قرآن کی روشنی میں مقامِ محمدیؐ ابھر کر سامنے آجائے۔

ان آیات تک پہنچنے سے پہلے، تمہید اً کچھ عرض کرنا ضروری ہے یہ نوعِ انسانی کی بدقسمتی تھی کہ ہمارے دور میں جس قوم (اہلِ مغرب) نے سائنس کی دنیا (کائناتی علوم) میں اس قدر تحقیق وتفتیش کی اُس کے سامنے مذہب (عیسائیت) وہ تھا جو علم کا دشمن اور عقل کا حریف تھا اور جن "حقائقِ کائنات" کو وہ وحی کی بناء پر پیش کرتا تھا وہ علمی تحقیقات کی روشنی میں ایک ثانیہ کے لئے بھی ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ اس لیے کہ جو وحی حضرت عیسےٰ کی طرف نازل ہوئی تھی وہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہ تھی اور جس تعلیم کو وحی (انجیل) کہا جاتا تھا وہ درحقیقت انسانوں کی خود ساختہ تعلیم تھی نتیجہ اس

کا یہ کہ یورپ کے یہ محققین نفسِ وحی ہی سے بدگمان ہو گئے۔ چنانچہ وہاں ایک فکری تحریک رونما ہوئی جس کی رُو سے کہا یہ گیا کہ اس کائنات کے پیچھے تو یقیناً ایک عظیم قوت ہے جو اسے اس حسن و خوبی سے چلا رہی ہے لیکن جہاں تک انسانی معاملات کا تعلق ہے، ان سے خدا اور اس کی راہ نمائی کا کوئی واسطہ نہیں۔ انسان کو اپنے معاملات عقل کی رُو سے طے کرنے چاہییں۔ انسانی راہ نمائی کے لئے عقل سے بلند کوئی سرچشمہ نہیں۔ یہ تحریک

HUMANISM

(Humanism) کے نام سے متعارف ہے۔ اس تحریک کے علمبردار اسے محض ایک فکری تحریک تک محدود رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک مذہب کی حیثیت سے اختیار اور رائج کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس تحریک کے ایک مشہور مفکر (Julian Huxley) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (Religion without Revelation) یعنی وہ مذہب جس کی بنیاد وحی پر نہیں ہے۔ اس وقت اس کی فرصت نہیں اور یوں بھی اس سے میں اپنے موضوع سے دُور ہٹ جاؤں گا ورنہ میں بتاتا کہ ہکسلے جس قسم کے مذہب کی تلاش میں ہے وہ کس طرح قرآن کی وحی میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ نہ صرف اتنا جتنے کی اسے تلاش ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔ اگر مغرب کے ان مفکرین کے سامنے قرآن ہوتا تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی کہ خدا کی وحی جو اپنی اصلی شکل میں ہو وہ نہ علم کی دشمن ہوتی ہے۔ نہ عقل کی حریف۔ اور اس کے پیش کردہ حقائق علمی تحقیقات کی روشنی میں مسلّمات بن کر اجاگر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بہر حال ان مفکرین کا مسلک یہ ہے کہ اُس خدا کو تو مان لیا جائے جس کے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں۔ لیکن اُس خدا سے انکار کیا جائے۔ جس کے قوانین انسانی دنیا میں راہ نمائی کا کام دیتے ہیں۔ اگر بہ نظرِ تعمق دیکھا جائے تو ان کی یہ روش ایک قسم کا نفسیاتی تضاد (Psychological Contradiction) ہے جس کی رُو سے وہ ایک طرف اُس تسکین کو بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں جو خدا پر ایمان سے نصیب ہوتی ہے اور دوسری طرف ان پابندیوں سے بھی آزادی چاہتے ہیں جو خدا پر ایمان کا لازمی جزو ہوتی ہیں۔

قرآن کا جواب

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ قرآن نے ان Humanists کو للکار کر پکارا ہے اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اس خود فریبی سے حاصل کیا ہے؟ محض کائناتی خدا کو ماننا اور انسانی دنیا سے اس کا کوئی واسطہ نہ سمجھنا، خدا پر ایمان نہیں۔ اس سے انکار ہے۔ لہٰذا اگر تمہیں اسے ماننا ہے تو پورے طور پر مانو اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً (۲/۲۰۸) اور اگر انکار کرنا ہے تو کھلے بندوں انکار کرو۔ یہ کیا کہ

منکرِ مے بودن و ہم رنگِ مستاں زیستن

آپ شاید کہیں کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں Humanist کہاں تھے جو اس نے انہیں للکار کر ان کی اس غلط روش پر متنبہ کیا۔ یہ تو ہمارے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس زمانے میں (Humanists) نام رکھنے والا طبقہ نہیں تھا۔ لیکن قرآن کا تو اعجاز ہی یہ ہے کہ وہ انسانی فکر کی ہر لغزش کو نمایاں (point out) کرتا اور اس

[ع]مل کو وضع کرکے مثبت دلائل سے اس کی تردید کرتا ہے۔ آپ دیکھئے کہ اس نے (Humanists) کی غلط [رو]ش کو کس انداز سے پیش کیا ہے اور کس طریق سے اس کی تردید کی ہے۔ سورۃ المومنون میں ہے قُلْ لِّمَنِ [الْاَ]رْضُ وَمَنْ فِيهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥ ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ سب کس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے ہے؟ اور اس کا مالک و آقا کون ہے؟ اس کے ساتھ ہی ان سے یہ بھی کہو کہ اس کا جواب تعصب اور جہالت سے نہ دیں۔ علم وبصیرت کی رو سے دیں۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اس کے جواب میں یہ یقیناً یہی کہیں گے کہ یہ سب خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لیے ہے اور وہی اس کا مالک اور آقا ہے سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ اس کے لیے کہ علم کی بارگاہ سے اس کے سوا کچھ اور جواب مل ہی نہیں سکتا۔ قرآن اس پر کہتا ہے کہ جب تمہاری عقل ودانش اور علم وبصیرت تمہیں اسی نتیجہ تک پہنچاتی ہے۔ تو پھر تم اصل حقیقت کو کیوں اپنے سامنے نہیں لاتے۔ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۳/۸۴-۸۵) اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ اس فضائے آسمانی میں تیرنے والے مختلف کروں میں جو کچھ ہے ان کی زندگی اور نشوونما کس قانون کے مطابق ہو رہی ہے؟ نہیں! اتنا ہی نہیں بلکہ یہ پوچھو کہ اس تمام کائنات کی نشوونما (Developement) کا مرکزی کنٹرول کس کے ہاتھ میں ہے قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۲۳/۸۶) اس کے جواب میں بھی یہ یہی کہیں گے کہ یہ سارا کنٹرول بھی خدا ہی کے لیے ہے (سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ) اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو پھر تم اس کی نگہداشت کیوں نہیں کرتے؟ (قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ) پھر قرآن یہ کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ کائنات کی ہر شے پر اقتدار کس کا ہے۔ کس کا قانون ہے جس کے تابع یہ تمام اشیاء اس طرح مصروفِ سعی وعمل ہیں۔ وہ کون ہے جس کی طرف ہر شے اپنی حفاظت کے لیے پناہ ڈھونڈھتی ہے اور جو اس کے قانون کی خلاف ورزی کرے اسے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ بتاؤ کہ تمہارا علم وبصیرت اس کا کیا جواب دیتا ہے قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۲۳/۸۸) وہ کہتا ہے کہ اس کے جواب میں بھی یہ یہی کہیں گے کہ یہ سب خدا ہی کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے (سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ)

خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کی ان کارفرمائیوں کا اقرار کر لینے کے بعد، قرآن یہ پوچھتا ہے کہ تم بتاؤ کہ جب تمہارا علم وبصیرت تمہیں خود اس نتیجہ پر پہنچا رہا ہے کہ

(۱) خارجی کائنات کی تمام اشیاء ایک غیر متبدل، مستقل، محکم قانون کے مطابق چل رہی ہیں۔ اور

(۲) یہ قوانین ان کے اپنے بنائے ہوئے نہیں بلکہ خدائے کائنات کے متعین کردہ ہیں۔

تو کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ انسان کے لئے بھی غیر متبدل قوانینِ حیات مستقل اقدار (Permanent Values) کی ضرورت ہے۔ اور یہ مستقل اقدار اس کی اپنی عقل وخرد کی وضع کردہ نہیں ہو سکتیں۔ وہ کون سی

بات ہے۔ جس سے تمہیں اس کا دھوکا لگتا ہے کہ انسان کائنات کے اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ ہے (فَاَنّٰی تُسْحَرُوْنَ) کیا انسان بھی اسی کائنات کا ایک حصہ نہیں؟ انسان کو اگر باقی اشیائے کائنات سے امتیاز حاصل ہے تو صرف اس بات میں کہ یہ ان قوانین کی اطاعت بطیبِ خاطر (اپنی مرضی سے) کرتا ہے۔ اور دیگر اشیائے کائنات ان کے مطابق چلنے کے لیے مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ انسان کے معاملہ میں یہ صورت نہیں کہ اسے مستقل قوانین کی ضرورت ہی نہیں یا یہ ان قوانین کو خود وضع کر سکتا ہے۔ یہ قوانین خدا ہی کی طرف سے مل سکتے ہیں۔ بَلْ اَتَیْنٰهُمْ بِالْحَقِّ ہم بھی انہیں اٹل اور غیر متبدل قوانین دے سکتے ہیں۔ اگر یہ ان قوانین سے انکار کرتے ہیں اور خارجی دنیا میں خدا کی کبریائی پر ایمان لاتے ہیں تو یہ اپنے دعوے ایمان میں جھوٹے ہیں۔ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۲۳۹/۹

خدا پر ایمان کے معنی

آپ نے غور کیا کہ قرآن کس طرح (Humanists) کے اس مسلک کی تردید کرتا ہے کہ خارجی کائنات میں خدا کی خدائی کو تسلیم کر لیا جائے۔ لیکن انسانی دنیا میں اس کی طرف سے راہ نمائی کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔ وہ اسے خدا پر ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسانی دنیا میں بھی خدا کی طرف سے عطا کردہ قوانین کی ضرورت سمجھی جائے۔ اور اس کی راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔

قرآن نے یہ کچھ چودہ سو سال پہلے کہا تھا۔ لیکن اب مغرب کے مفکرین (Humanism) کے مسلک کی بنیادی غلطی کو محسوس کر کے خود اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ خدا کو ماننے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی راہ نمائی پر ایمان لایا جائے چنانچہ ہمارے دور کا ایک عظیم طبیعیاتی (Physicist) ایڈنگٹن اپنی کتاب Science and the Unseen World میں لکھتا ہے کہ

اہلِ مغرب کا اعتراف

اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہنمائی کرتا ہے[1]

اوسپنسکی (Ouspensky) اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ اگر وحی کا تصور نہ ہو تو مذہب ہی باقی نہیں رہتا۔ اور مذہب میں کوئی عنصر تو ایسا ہوتا ہے۔ جو فکر انسانی کے احاطے سے باہر ہو۔ اس لئے اگر یہ کوشش کی جائے کہ جن باتوں کو انسانی عقل اچھا سمجھتی ہے۔ انہیں ایک جگہ اکٹھا کر کے اس کا نام مذہب رکھ لیا جائے۔ تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ایسی کوششوں کا نتیجہ مذہب نہیں بلکہ ایک زبوں حال فلسفہ ہوگا۔

(New Model of the Universe)

[1] یہ الگ سوال ہے کہ ایڈنگٹن کے ذہن میں وحی کا تصور کس قسم کا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ خود مغرب کے مفکرین کس طرح، خدا کے ساتھ وحی کی ضرورت کو لانیفک قرار دے رہے ہیں۔ یعنی انکے نزدیک، مقامِ نبوّت کے بغیر مذہب کا تصور ہی ممکن نہیں۔

اب یہ دیکھئے کہ قرآن نے مقامِ نبوّت کو کن الفاظ میں سمجھایا ہے۔ لیکن یہاں پھر چند الفاظ تمہیداً ضروری ہیں

کتاب کیسی ہو؟

اسی ہکسلے نے اگست ۱۹۵۲ء میں نیویارک میں ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ جس مذہب کی تلاش میں وہ ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُسے پیش ایسے انداز میں

جو ایک طرف ایسا سلیس اور سادہ ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے نفع اندوز ہوسکیں اور دوسری طرف اس قدر عمیق اور پُرمعنی کہ ایک بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہوجائے۔ (نیویارک ٹائمز ۲۲ ۸ ۵۲)

دیکھئے کہ قرآن کریم اس معیار پر بھی کس طرح پورا اترتا ہے۔ اُسے بات یہ سمجھانی ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں ہر شے ایک غیر متبدّل قانون کے تابع سرگرمِ عمل ہے اور وہ قانون اس کا اپنا وضع کردہ نہیں، اسی طرح انسان کے لیے بھی اسی قسم کے غیر متبدّل قوانین کی ضرورت ہے۔ جو اسے وحی کی رُو سے ملیں۔ قرآن کو یہ بات سمجھانا تھی اور سب سے پہلے) سمجھانا تھی اُس قوم کو جو نہ کارگہِ کائنات کے نظم و نسق سے واقف تھی نہ سائنٹیفک تحقیقات سے آشنا

قرآن کی اوّلیں مخاطب قوم

اس قوم کی علمی سطح کیا تھی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ قوم آج سے چودہ سو سال پہلے کے زمانے میں تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جسے دورِ حاضرہ والے تاریک زمانہ (Dark Ages) کہتے ہیں۔ یعنی خود زمانے کے اعتبار سے وہ دور تاریکی کا دور تھا۔ پھر اس تاریکی کے دور میں عرب کا ملک، اپنے ہم عصر ممالک میں، تہذیب و تمدن تو ایک طرف، علم و بصیرت میں بھی سب سے پیچھے تھا۔ اس خطہ میں ایسے لوگ بھی بہت کم تھے جو معمولی نوشت و خواند ہی سے واقف ہوں۔ یہ لوگ اونٹوں کے دودھ اور کھجوروں کی گٹھلیوں پر گذارہ کرتے تھے۔ یہ تھے اوّلین مخاطب جنہیں یہ سمجھانا تھا کہ تمہیں زندگی میں مستقل قوانین کی ضرورت ہے اور یہ قوانین وہاں سے ملیں گے جہاں سے خارجی کائنات کو قوانینِ فطرت ملے ہیں۔ دیکھئے کہ قرآن اس بلند اور دقیق حقیقت کو ان لوگوں کو کن الفاظ میں سمجھاتا ہے اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس حقیقت کو جن الفاظ میں اس جاہل اور ناخواندہ قوم کو ازمنہ مظلمہ میں سمجھایا گیا تھا وہی الفاظ آج اس دورِ علم و تمدن میں بلند ترین مفکروں کے سامنے کس طرح انکشافِ حقیقت کرتے ہیں؟

وہ بادیہ نشین قوم تھی۔ زندگی کا معمول یہ کہ ــــ ہر صبح سفر، ہر شام سفر ــــ بلکہ صبح تو گاہے ماہے۔ سفر اکثر و بیشتر شام ہی کو ہوتا۔ اس لئے کہ دن کے وقت ریگستان میں سخت گرمی ہوتی۔ اور انکے کارواں اکثر راتوں کو سفر کرتے لیکن ان کا یہ سفر گرانڈ ٹرنک روڈ پر نہیں ہوتا تھا کہ پشاور سے چلئے اور آنکھیں بند کئے سیدھے کلکتہ پہنچ جایئے۔ ان کا سفر صحراؤں میں ہوتا جن میں نہ کہیں سڑکیں تھیں نہ نشاناتِ راہ۔ اگر کبھی کسی نے کوئی نشانات متعین بھی کر لیے۔ (مثلاً

یہ کہ یہاں کوئی ٹیلہ ہے اور وہاں کچھ جھاڑیاں، تو صحرا میں چلنے والی ہوائیں اور ان سے اڑنے والی ریت دوسری شام تک ان نشانات کو بدل کر رکھ دیتی۔ جہاں کل ٹیلہ تھا وہاں آج گڑھا ہے۔ جہاں گڑھا تھا۔ وہاں ریت کا ڈھیر ہے۔ پھر، وہاں بستیاں اور آبادیاں بھی قریب قریب نہ تھیں کہ مقامی لوگوں سے راستہ پوچھ لیا جائے۔ آپ غور کیجئے کہ وہ ان حالات میں سفر کرتے تھے اور وہ بھی تاریک راتوں میں۔

ستاروں کی راہ نمائی

ان سے کہا گیا کہ تم جوان صحراؤں میں، اندھیری راتوں میں سفر کرتے ہو اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تم راستے کی تلاش میں مارے مارے پھرو۔ یا راستہ پا لینے کے بعد پھر بھٹک جاؤ۔ تو ایسا کس طرح۔ سے ہوتا ہے؟ وہ کون سے مستقل نشانات ہیں جن سے تم راہ نمائی حاصل کرتے ہو؟ ان کا جواب صاف اور سیدھا تھا کہ ہم تاریک راتوں میں ستاروں سے راہ نمائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ ایسے سچے راہبر ہیں کہ راستہ دکھانے میں نہ کبھی غلطی کرتے ہیں نہ دھوکا دیتے ہیں۔ قرنہا قرن سے ہمارا یہ تجربہ ہے اور نسلاً بعد نسلٍ اس کی شہادت ملتی چلی آرہی ہے۔ ان کی راہ نمائی پر نہ زمانے کا اختلاف اثر انداز ہوتا ہے نہ ملکوں کا بُعد اور تفاوت۔ یہ ہر زمانے اور ہر قوم کو یکساں راہ نمائی دیتے ہیں۔ ان کا شروع سے یہی انداز چلا آرہا ہے۔ اور آج بھی ان کی یہی روش ہے۔

اس پر ان سے کہا گیا کہ ذرا سوچو کہ جس خدا کی طرف سے ستاروں کو یہ صلاحیت حاصل ہوئی ہے کہ وہ اپنی راہ نمائی میں نہ غلطی کرتے اور نہ دھوکا دیتے ہیں۔ اگر اسی خدا کی طرف سے تمہیں بھی راہ نمائی ملے تو کیا وہ راہ نمائی بھی ستاروں کی راہ نمائی کی طرح مستقل، غیر متبدل قابلِ اعتماد، سہو و خطا سے مبرا اور فریب دہی کے امکان سے بلند و بالا ہوگی یا نہیں؟

والنجم اذا ھوٰی

یہ ہے وہ مقام جہاں سے سورہ والنجم کی ابتدا ہوتی ہے۔ یعنی وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (۵۳/۱) طلوع ہونے والا ستارہ۔ جب وہ اپنا راستہ طے کرنے کے بعد غروب ہوتا ہے۔ اس حقیقت کبریٰ پر شاہد ہے کہ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (۵۳/۲) تمہارا یہ رفیقِ سفر جو تمہیں زندگی کے صحیح راستے کی طرف لے جانا چاہتا ہے، نہ تو راستے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے اور نہ ہی راستہ پا جانے کے بعد بھٹک گیا ہے اس لیے کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (۵۳/۳) یہ جو کچھ کہتا ہے اپنے تخیلات و تصورات سے نہیں کہتا۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۵۳/۴) یہ صرف اس وحی کو بیان کرتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کو دی جاتی ہے۔

انسانی خیالات کی کیفیت

انسانی خیالات کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔

زماں زماں شکند آں چہ می تراشد عقل

جو باتیں ہم بچپن میں کرتے ہیں، ذرا آگے بڑھ کر دیکھئے تو ان پر خود ہی بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ جوانی کے جن

کو ہم عقل وتدبیر اور دانش وبینش کا کمال سمجھتے ہیں، پانچ سات برس بعد، وہ چند نادانیوں سے زیادہ کچھ نہیں دیتے اس کے بعد علم وتجربہ میں کچھ پختگی آنے لگی ہے تو بڑھاپا آجاتا ہے جس میں (قرآن کے الفاظ میں) دندھی ہوجاتی ہے۔ یہ کیفیت تو عمر کی مختلف منزلوں میں ہوتی ہے۔ ایک ہی منزل میں حالت یہ ہوتی ہے کہ صحت کے عالم میں خیالات اور کس قسم کے ہوتے ہیں، بیماری کے زمانے میں اور قسم کے۔ حالات مساعد ہوں تو یہ نگاہ اور قسم کا ہوتا ہے اور جب پریشانیاں گھیر لیں تو تمام نظریات وتصورات بدل جاتے ہیں۔ غصے کے عالم میں ہمارے خیالات اور قسم کے ہوتے ہیں اور سکون کی حالت میں اور قسم کے۔ یہ حالت تو افراد کی ہے۔ اگر قوموں کی زندگی پر نگاہ ڈالی جائے تو وہاں بھی یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ جن باتوں کا کوئی قوم سو سال پہلے علم ودانش کی معراج سمجھتی تھی آج وہ خود ان پر ہنستی ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے خیالات سے کوئی بات کہے گا وہ اس کی طبعی کیفیات اور

وحی کی خصوصیت

ذہنی اور قلبی میلانات سے متاثر اور اس کے زمانے کے احوال وظروف سے متسم ہوگی اس لیے وہ کبھی مستقل اقدار (نہ بدلنے والے قوانین) کا تعین نہیں کر سکے گا۔ یہ چیز صرف اُس سرچشمہ سے مل سکے گی جو زمان ومکان کے ہر قسم کے اثرات سے مبرّیٰ ہو۔ اور قلبی وذہنی عواطف ومیلانات کی رنگینی سے معرّا اسے وحی کہتے ہیں۔

انہی حقائق کو قرآن نے دوسرے مقامات پر بھی بیان کیا ہے۔ ستاروں کی راہ نمائی کے متعلق سورہ انعام میں ہے وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۶/۹۸) اللہ وہ ہے جس نے تمہارے فائدے کے لیے ستاروں کو اس انداز سے بنایا کہ تم ان سے زمین اور سمندر کے سفر کی تاریکیوں میں راہ نمائی حاصل کر سکو۔ سورہ واقعہ میں کہا کہ فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ (۵۶/۷۵) نہیں! بات یوں نہیں جیسے تم اپنے ذہن میں خیال کئے ہو بات کچھ اور ہے اس کے بارے میں ستاروں کی گذرگاہوں (ان کے طلوع وغروب کے مواقع) کو شہادت میں پیش کرتا ہوں وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ (۵۶/۷۶) اور اگر تم علم وبصیرت کی بارگاہ سے پوچھو تو وہ تمہیں بتائے کہ یہ شہادت کس طرح بنیادی اور رفیع الشان ہے۔ یہ شہادت کس امر کی ہے؟ اس امر کی کہ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ (۵۶/۷۷) حقیقت ہر قسم کی شک وشبہ سے بالا ہے کہ یہ قرآن نوعِ انسان کے لیے بڑا ہی نفع رساں اور عزت بخش ہے فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ (۵۶/۷۸) اس کے حقائق غیر متبدل ہیں اور وہ خود بھی ایک محفوظ کتاب کے اندر ہے۔ اس لئے اس کے حروف و ... میں بھی کوئی تغیر وتبدل نہیں ہو سکتا۔ حقائق کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ الفاظ ہی ہوتے ہیں۔ اگر الفاظ میں ... ہو جائے تو حقائق میں بھی تبدیلی ہوجاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور شرط بھی ہے اور وہ یہ کہ الفاظ کا صحیح ... اسی صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے۔ جب ان الفاظ کو خالی الذہن ہو کر سمجھا جائے۔ اگر انسان پہلے سے اپنے خاص خیالات اور تصورات لے کر قرآن کی طرف آئے تو قرآنی حقائق اپنی اصلی اور بلا آمیزش شکل میں

قرآن سمجھنے کا طریقہ

سامنے نہیں آسکیں گے۔ اس لیے تطہیرِ فکر و نظر نہایت ضروری ہے لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶/۷۹) اس کے حقائق کو صرف وہی پا سکتے ہیں جن کا قلب و دماغ غیر قرآنی تصورات سے پاک ہو۔ جن کا ادراک بے رنگ ہو۔

پھر جس طرح ستاروں کی رہنمائی تمام اقوامِ عالم اور جملہ ممالکِ دنیا کے لیے یکساں ہے اسی طرح، قرآن کی راہنمائی بھی زمان و مکان کی حدود سے بے نیاز اور تمام نوعِ انسانی کے لیے یکساں ہے۔ اس لئے کہ یہ اُس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو پورے عالمِ انسانیت کا نشوونما دینے والا ہے تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۵۶/۸۰) اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ (۵۶/۸۱)۔ ذرا سوچو کہ تم اس قسم کے محکم، غیر متبدل، یقینی ستاروں کی طرح واضح اور روشن ضابطۂ حیات کو جھٹلاتے ہو؟ اس سے اِدھر اُدھر پھسلنا چاہتے ہو۔ اس میں کمی بیشی کر کے، مداہنت اور مفاہمت (Compromise) کی راہیں تراشنے کی کوشش کرتے ہو؟ تم چاہتے ہو کہ اس میں تمہاری مرضی کے مطابق تھوڑا سا ردّ و بدل کر دیا جائے! بتاؤ کہ اگر ستارے، لوگوں کی خواہش کے مطابق اپنے راستے بدلنے لگ جائیں تو راستہ چلنے والوں کا کیا حشر ہو؟

اور ایسی روش تم اختیار کیوں کرتے ہو؟ محض اس لیے کہ تم نے مذہبی پیشوائیت کو اپنے لئے ذریعۂ معاش (روٹی کا آسرا) بنا رکھا ہے اور قرآنی مسلک اختیار کرنے سے وہ چیز چھن جاتی ہے؟ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (۵۶/۸۲) ذرا سوچو کہ کس قدر پست مقصد کی خاطر تم اتنی بلند حقیقت کو جھٹلاتے اور اس سے مداہنت اختیار کرتے ہو۔

اسی طرح، سورۂ تکویر میں ہے فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ۔ میں یہ باتیں یونہی بیان نہیں کر رہا۔ اس حقیقت پر سارا نظامِ کائنات شاہد ہے۔ اس پر شاہد ہیں وہ ستارے جو دبے پاؤں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے رہتے ہیں اَلْجَوَارِ الْكُنَّسِ اور وہ نیّر خرام ستارے جو اپنی اپنی منزل طے کر کے چھپ جاتے ہیں وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ اور رات جو خاموشی سے آتی ہے اور خاموشی سے چلی جاتی ہے وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (۸۱/۱۵-۱۸) اور صبح جب وہ حیاتِ نو کا پیغام لے کر نمودار ہوتی ہے۔ یہ سب مظاہرِ کائنات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ۔ جو ہماری وحی کی بات تم سے کہہ رہا ہے وہ ہمارا بھیجا ہوا پیغامبر ہے۔ اور نہایت معزز پیغامبر ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ (۸۱/۲۰-۱۹) اسے اس خدا کی طرف سے بڑی قوتیں عطا ہوئی ہیں جو کائنات کے مرکزی کنٹرول کا مالک ہے۔

بہرحال یہ ہے وہ انداز جس سے قرآن نے اس صحرا نشین قوم کو اتنی بلند اور ایسی لطیف حقیقت سے آگاہ کیا، اگر آپ کو دیکھنا ہو کہ ستاروں کی انہی گذرگاہوں سے دورِ حاضر کے بلند پایہ سائنسداں کس طرح ان حقائق تک پہنچے ہیں تو زیادہ

ماہرینِ فلکیات کا اعتراف

...ونکم) سرجیمز جینس کی مشہور کتاب (The Starry Way of Heavens) یا (Mysterios Univers...) کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ عصرِ حاضر کا یہ سب سے بڑا ماہر افلاکیات، اس ...قون کارگہِ سماوی کے مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد، خدا کے بلند و بالا قانون کی عظمت و جلال کے سامنے کس ... سجدہ ریز ہوتا ہے۔ وہ ان اجرامِ فلکی کی نقل و حرکت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتا ...کہ قانونِ خداوندی کے محکم اور غیر متبدّل ہونے پر ستاروں کی شہادت فی الواقعہ ایک عظیم شہادت ہے وَاِنَّہٗ ...لَمُوْنَ لَقَسَمٌ عَظِیْمٌ۔

...مارے معاشرہ کی حالت

اب برادران! آگے بڑھیئے۔ ہمارے ہاں معاشرہ کی جو حالت ہو رہی ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ لوگوں کے دلوں میں قانون کا احترام بہت کم رہ ...یاب ہے قانون کی کتابوں کو دیکھئے تو وہ اعلیٰ درجہ کے قوانین سے بھری پڑی ہیں لیکن افرادِ معاشرہ کو دیکھئے تو ...نون پر عمل بہت کم ہو رہا ہے۔ چوری نہ کرو، جھوٹ نہ بولو۔ کسی کو فریب نہ دو۔ کسی سے "چار سو بیس" نہ کرو۔ ...یک مارکٹ سے مجتنب رہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ تمام قوانین اور ہدایات موجود ہیں لیکن ان پر عمل کوئی نہیں کرتا۔ یہی ...ں کہ ان پر عمل نہیں ہوتا۔ حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ جو شخص دیانت دار اور صداقت پسند رہنا چاہے ...ے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ اس صورتِ حال کا تذکرہ کسی ذمہ دار اہلِ حل و عقد سے ...ے وہ فوراً کہہ دے گا کہ کیا کیا جائے؟ قانون تو موجود ہے لیکن اس کے نافذ کرنے کی مشینری بہت کمزور اور ...ں ہو چکی ہے۔ اس لئے معاشرہ میں ہر طرف فساد ہی فساد ہے۔

...نون کے ساتھ قوّت

اس سے ظاہر ہے برادران! کہ صرف اچھے قانون کا ہونا کافی نہیں۔ اس قانون کے پیچھے قوّتِ نافذہ کا ہونا بھی ازبس ناگزیر ہے۔ اگر قوّتِ نافذہ کمزور ...قانون کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

...شرہ کے برعکس، آپ خارجی کائنات پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ وہاں فطری قوانین کس حسن و خوبی سے کارفرما ...پنائیوں میں تیرنے والے ان عظیم کرّوں کو دیکھئے کہ ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں کس نظم و ضبط کے ...وقِ سعی و عمل ہے۔ ماہرینِ افلاک کا کہنا ہے کہ یہ کہکشاں، جو ہمیں محض گردِ مرمریں یا جوئے شیر نظر ...یاروں اور ستاروں (ثوابت و سیار) کی ایک عظیم کائنات ہے جس میں ایک ایک کرّہ، نہ صرف ...ے نظامِ شمسی سے اس قدر بڑا ہے جیسے تِل کے سامنے پہاڑ۔ یہ تمام محیّر العقول کارگہ اور اس کی

یہ ہوش ربا مشینری روزِ اوّل سے آج تک، غیر مرئی اور نامحسوس باہمی کشش کے ذریعے، اس حدود نا آشنا فضا میں لاکھوں میل فی سیکنڈ کی رفتار سے، مصروفِ حرکت ہے لیکن کیا مجال جو اس میں کبھی ذرا سا بھی ٹکراؤ پیدا ہو جائے اس "کارگہِ شیشہ گراں" کی حالت یہ ہے کہ اگر ان کروڑہا کروڑ اجرامِ فلکی میں سے کسی ایک میں، ایک ذرے کے برابر بھی کشش میں کمی، یا اس کی رفتار میں تیزی یا سستی واقع ہو جائے تو یہ سارے کا سارا نظام ایک لمحہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

آسمانوں سے نیچے اُتر کر اپنی زمین کی طرف آئیے تو قانونِ خداوندی کی کارفرمائی اور نتیجہ خیزی نگہِ بصیرت کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ ایک ہی قطعۂ زمین میں برابر برابر ببول اور آم کے بیج ڈال دیجئے۔ وہی مٹی ہے وہی پانی۔ وہی ہوا ہے وہی روشنی۔ وہی برودت ہے وہی حرارت۔ لیکن آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ببول کے تخم سے آم کا پیڑ اُگ آیا ہو اور آم کے درخت میں ببول کے کانٹے لگ گئے ہوں۔ آپ غور کیجیے برادران! کہ جس ہستی نے کائنات کے لئے ایسے غیر متبدل قوانین متعین کئے ہیں وہ کس قدر صاحبِ اقتدار و جبروت ہے کہ ہر قانون اپنا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کئے جا رہا ہے۔ اب آپ سوچئے کہ جب اُسی خدا کے قوانین (جو وحی کی رُو سے ملیں) انسانی دنیا میں بھی کارفرما ہو جائیں تو وہ کس طرح اپنے صحیح صحیح نتائج بحسن و خوبی پیدا کرتے چلے جائیں گے؟ اس حقیقت کے اظہار کے لئے سورۂ والنجم میں وحی کے بیان کے بعد کہا کہ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى (۵۳/۵) نبی کو اس وحی کا علم اس ہستی نے دیا ہے جو بڑی زبردست قوتوں کا مالک ہے۔ وہ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۱/۵۸) ہے۔ لہٰذا ہو نہیں سکتا کہ جو معاشرہ اس کے قوانین کے مطابق چلے، اسے ان قوانین کے نتائج و ثمرات نصیب نہ ہوں۔ وہ ان نتائج سے ضرور بہرہ یاب ہوگا لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ (۳۹/۲۰) اللہ کے وعدے ضرور پورے ہو کر رہا کرتے ہیں۔

اب اور آگے چلئے۔

کائنات کی مشینری کا ہر پرزہ اس لیے مصروفِ سرگردانی ہے کہ ہر شے کی مضمر صلاحیتوں (Potentialities) کی پوری پوری نشوونما (Developement) ہو سکے۔ ابر و باد و مہ و خورشید، سب اس لئے مصروفِ کار ہیں کہ رائی کا ایک ننھا سا دانہ پودا بن کر سات سات سو دانے پیدا کرے۔ یہ اس دانے کی تقدیر یا (DESTINY) ہے۔ یہ اس کی زندگی کی آخری منزل ہے۔ یہ اس کی مضمر صلاحیتوں کی تکمیل کا آخری نقطہ ہے۔ لہٰذا خدا کا کائناتی قانون

ہر شے کی ربوبیت

اس حسن و خوبی سے اس لئے سرگرمِ عمل ہے کہ ہر شے کی ربوبیت (پرورش، نشوونما) ہوتی چلی جائے۔ وہ اپنے نقطۂ آخرین تک جا پہنچے۔ اس کی صلاحیتوں کی تکمیل ہو جائے۔ لیکن اشیائے کائنات کی نشوونما، قانونِ ارتقاء (Evolution) کے ماتحت ہوتی ہے۔ اس کا مطلب

شے۔ ہر آن، سلسلۂ ارتقاء کی ایک نئی منزل (Stage) میں داخل ہوتی ہے، جہاں اس کی نشوونما کے تقاضے اس کی سابقہ منزل سے مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا خدا کا قانونِ ربوبیت ایسا ہے کہ کوئی شے جس حالت میں ہو، اس کے مطابق سامانِ نشوونما بہم پہنچاتا ہے یَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، اپنی نشوونما کے لیے سب خدا کی ربوبیت) کے محتاج ہیں۔ اور ان میں سے ہر چیز کی حالت یہ ہے کہ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (۵۵/۲۹) وہ ہر آن میں ایک نئے انداز کو لئے ہوتی ہے جس میں اسکی پرورش کے تقاضے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور یہ اس کے قانونِ ربوبیت کا کمال ہے کہ جو

بدلتے ہوئے تقاضے

شے جس حالت میں ہو وہ اسی کے مطابق اس کی نشوونما کا سامان عطا کر دیتا ہے۔

بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی ماں کی چھاتیوں میں دودھ کے چشمے رواں ہو جاتے ہیں۔ یہ دودھ شروع میں بہت پتلا ہوتا ہے۔ پھر جوں جوں، بچے کو زیادہ غذا (Nourishment) کی ضرورت ہوتی ہے دودھ میں غذا کے اجزا زیادہ ہوتے جاتے ہیں اور پانی کی مقدار کم۔ اس کے ساتھ ہی بچے کے معدے میں ہضم کی قوت بھی بڑھتی جاتی ہے تاکہ وہ ثقیل دودھ کو جزوِ بدن بنا سکے۔ پھر، جب وہ خارجی غذا ہضم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اسے دانت دے دیئے جاتے ہیں۔ اور دودھ کی نہریں خشک ہو جاتی ہیں۔ وقس علیٰ ذالک۔ ہر شے کو اس کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق سامانِ نشوونما ملتا چلا جاتا ہے۔

جس طرح طبعی دنیا میں نشوونما کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں اسی طرح انسانیت کی دنیا میں بھی نشوونما و ارتقاء کے تقاضوں میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اگر آج افریقہ کے حبشی اپنے جوہرِ انسانیت کی نشوونما کے لئے نظامِ خداوندی کو اختیار کریں تو ان کی نشوونما کے تقاضے اور ہوں گے۔ اور اگر یورپ کی متمدن اقوام یہی کچھ چاہیں تو ان کے تقاضے ان سے مختلف ہوں گے۔ لہٰذا، انسانوں کی دنیا میں خدا کا قانون بھی ایسا ہونا چاہیئے جو انسانی ذات کے متقل جوہروں کی پرورش اور بالیدگی زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق کرتا چلا جائے۔ اس کے لئے فرمایا کہ وحی کا قانون جو اپنی نتیجہ خیزی میں حتمی اور یقینی واقع ہوا ہے۔ اُس خدا کا قانون ہے جو ذُوْمِرَّةٍ (۵۳/۶) ہے۔ یعنی زندگی کی تمام گذرگاہوں کا مالک۔ زمان اور مکان، دونوں اعتبار سے زندگی کے تمام بدلتے ہوئے تقاضوں سے باخبر اور ان کی نشوونما کا پورا پورا انتظام کرنے والا۔ رب العالمین۔

مقامِ محمدیؐ کا آغاز

یہاں تک برادران! گفتگو وحی یا اس خدا کے متعلق ہو رہی تھی جو وحی کو عطا کرتا ہے۔ اب اُس گراں مایہ ہستی کا تذکرہ آتا ہے جس کا منور و مقدس سینہ وحی کا مہبط بنتا ہے۔ خود نبی کا تذکرہ۔ لہٰذا یہاں سے مقامِ نبوت یا مقامِ محمدیؐ کا آغاز ہوتا ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے پہلے سے بھی

زیادہ ذوق وانہماک کی ضرورت ہے۔ نہ صرف ذوق وانہماک کی بلکہ تعظیم واحترام کی بھی کہ

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

آج کل ہم (مسلمانوں) میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ نبی کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ خدا کی طرف سے حاصل کردہ وحی کو دوسروں تک پہنچا دے اور بس۔ یعنی جب وہ پیغام خداوندی کو دوسروں تک پہنچا دیتا ہے تو اس کے بعد اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی اُن کے خیال کے مطابق یوں سمجھئے کہ نبی کی حیثیت (معاذ اللہ) ایک ریڈیو کے سیٹ کی سی ہوتی ہے۔ جو کچھ براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے براڈ کاسٹ (نشر) ہوتا ہے، یہ سیٹ اسے اخذ کر لیتا ہے۔ اور بعینہٖ اسی طرح دوسروں تک پہنچا دیتا ہے۔ جب براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے کچھ نشر نہیں ہوتا تو ریڈیو محض ایک لکڑی کا ڈبہ رہ جاتا ہے۔

مقامِ نبوت کے متعلق ایک عظیم غلطی

اس کے علاوہ، بعض لوگوں کو ایک اور غلطی بھی لگتی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وحی چونکہ اکتسابی چیز نہیں بلکہ وہبی ہے۔ یعنی وحی میں نبی کے اپنے کسب وہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ علم اسے خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اس لئے نبی میں کسی ذاتی صلاحیت اور قابلیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خدا نے اپنی وحی کسی نہ کسی ذریعے انسانوں تک پہنچانی ہوتی ہے اس لیے اس مقصد کے لیے جو انسان بھی اس کے سامنے آجائے وہ اس کے ذریعے وحی کو انسانوں تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ ہے وہ خیال جس کا مظہر وہ شعر ہے جو ہمارے ہاں بڑا مقبول ہے اور جسے عام طور پر بار بار دہرایا جاتا ہے۔ یعنی۔

خدا کی دین کا موسےٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

یعنی اللہ تعالےٰ کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آچکا تھا کہ خدا کی وحی بنی اسرائیل تک پہنچا دی جاتی۔ اُس وقت اتفاق سے حضرت موسےٰ آگ کی تلاش میں اُدھر آ نکلے تو اللہ میاں نے تاجِ نبوت ان کے سر پر رکھ دیا۔ اگر اس وقت ان کی جگہ کوئی اور وہاں جا پہنچتا تو یہی پیمبری اسے مل جاتی!

یہ خیال بھی بنیادی طور پر غلط ہے اور مقامِ نبوت سے یکسر بے خبری کا نتیجہ۔ اس کے ازالہ کے لیے خود حضرت موسیٰ ہی کی مثال لیجئے (جن کے متعلق نہایت بے تکلفی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ آگ لینے کو گئے اور پیغمبری مل گئی!) سنئے کہ اللہ تعالےٰ ان کے منصب نبوت پر سرفراز ہونے کے سلسلہ میں کیا کہتے ہیں۔ جب حضرت موسیٰ کو وحی

...کی تربیت

سے نوازا گیا اور فرعون کے خلاف جس مہم پر جانے کے لیے ان سے کہا گیا تھا۔ اس کے لیے ان کی طرف سے پیش کردہ متعدد درخواستیں منظور کر لی گئیں تو حضرت موسےٰ کا سر (شک)ری طور پر) احساسِ سپاس گذاری سے بدرگاہِ ربّ العزّت جھک گیا۔ اُس وقت آپ سے کہا گیا کہ "اے موسیٰ! تم نے اسی کو ہمارا احسان سمجھا اور اس کے لئے جذباتِ تشکر تمہارے آبگینۂ قلب سے ابھر آئے تمہیں معلوم نہیں کہ یہ سلسلۂ احسانات کب سے شروع ہے؟ اس کے لئے تمہیں بہت پیچھے جانا ہوگا۔ یہ سلسلہ اسی دن سے شروع ہوگیا تھا جب تم پیدا ہوئے تھے وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ (۲۰/۳۷) جب ہم نے تمہاری ماں سے کہا تھا کہ تمہیں ایک صندوق میں لٹا کر دریا میں بہا دے۔ اس نے اس حکم کی تعمیل کی اور تمہارا صندوق فرعون کے محلات میں جا پہنچا۔ اس طرح ہم نے اس کا انتظام کر دیا کہ تمہاری پرورش فرعون کے محلات میں ہو۔ تمہیں بڑے ہو کر (نبی بنکر) فرعون سے ٹکر لینی تھی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ تم رموزِ سلطنت اور اسرارِ حکومت سے واقف ہوتے۔ لیکن تم ایک محکوم قوم (بنی اسرائیل) کے فرد تھے۔ اس لئے تمہارے لئے ان اسرار و رموز تک بار پانا ناممکن تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم نے یہ تدبیر کی کہ تمہاری پرورش و تربیت خود محلاتِ شاہی میں ہو۔ تمہیں ساری عمر شاہزادگی یا شاہنشاہی کی زندگی بسر نہیں کرنی تھی، تمہاری پیدائش سے مقصود کچھ اور تھا۔ تمہیں ایک دن بنی اسرائیل کو لے کر وادیٔ سینا کے جنگلوں پہاڑوں اور بیابانوں میں بھی جانا تھا اور وہاں ان کی تربیت کرنی تھی۔ اس لئے یہ بھی ضروری تھا کہ تم صحرائی اور بیابانی زندگی سے بھی واقف ہو جاؤ۔ اس مقصد کے لیے ایسی تدبیر کی گئی کہ تم شاہی محلات کو چھوڑ کر مدین کی طرف بھاگ نکلو فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ (۲۰/۴۰)، سو تم کئی برس اہلِ مدین میں رہے۔

اس طرح جب تم ان تمام مختلف مراحل سے گذرے تو ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَا مُوسَىٰ (۲۰/۴۰) تب کہیں جا کر تم ہمارے پیمانے پر پورے اُترے وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي (۲۰/۴۱) اس طرح ہم نے تمہیں اپنے ایک مقصد کے لئے بہ کمالِ حسن و خوبی تیار کیا اور جب تم اس طرح اس مقصدِ بلند کے قابل ہو گئے تو تمہیں وحی عطا ہوگئی۔ یہ نہیں کہ تم یونہی لینے کو اُدھر آ نکلے اور ہم نے نبوت کا تاج تمہارے سر پر رکھ دیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ ایک ہونے والے نبی کو پہلے ہی دن سے منصبِ نبوت کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے خود اس کا علم نہیں ہوتا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ (۴۲/۵۲)، اس لیے کہ نبی کے اپنے کسب و ہنر کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ لیکن نبی کے سینے کو ایسی گراں بہا متاع کا امین بننے کے لئے خاص طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ اس مقصدِ عظیم کے لیے نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس میں کیا

...ستویٰ

کیا خصوصیتیں پیدا ہوئی تھیں۔ سورہ والنجم کی اگلی آیات میں ان کا ذکر ہے۔ اس کے لئے قرآن

نے سب سے پہلے ایک لفظ استعمال کیا ہے فَاسْتَوٰی (۵۳/۶) دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا لفظ ہے۔ لیکن معنویت کے اعتبار سے یہ اس قدر جامع ہے کہ انسانی ذات کی معراجِ کبریٰ کی ساری تابانیاں اس کے اندر متمرکز ہو گئی ہیں۔ اس کے مفہوم کے لیئے یوں سمجھئے جیسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں کہتے ہیں (—— Balanced Personality) وہ ذات جس میں انسانیت کی مضمر صلاحیتیں مکمل طور پر نشوونما پاکر، پورے پورے اعتدال اور حسنِ توازن و تناسب کے ساتھ جمع ہوں۔ جس میں انسانی قوتیں اور جوہر انتہائی اعتدال کے ساتھ جلوہ فرما ہوں۔ برادران! آپ سوچئے کہ ارتقائے شرفِ انسانیت میں اس سے بڑا مقام اور کونسا ہو سکتا ہے یہ ہے وہ پہلی خصوصیتِ کبریٰ جس سے مقامِ محمدیؐ کی ابتداء ہوتی ہے۔ یعنی حسنِ سیرت کی کمالِ زیبائی و رعنائی۔ مختلف صفاتِ انسانیہ کا پورا پورا اعتدال خدا نے خود اپنے متعلق جو اسماء الحسنیٰ کہا ہے تو اس کا بھی یہی مطلب ہے۔ یعنی وہ ذات جس میں تمام صفات (اسماء) اپنی مکمل صورت میں بایں انداز جمع ہوں کہ ان میں پورا پورا تناسب پایا جائے۔ تناسب (Proportion) کا اعتدال ہی درحقیقت حسن ہے۔ حسنِ عمل بھی وہی ہے جس میں صحیح صحیح تناسب و اعتدال ہو۔ صحیح اعمال وہ ہیں جن میں صفاتِ خداوندی کی جھلک ہو۔ لیکن ان میں اعتدال کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اسی لیئے قرآن میں ہے وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا۔ تمام صفات، کامل اعتدال کے ساتھ حسن کارانہ انداز سے خدا کی ذات میں جمع ہیں۔ اُسے انہی صفات کے ساتھ پکارو۔ یعنی اپنی ذات میں انہی صفات کو اُجاگر کرو۔ لیکن اسی اعتدال و تناسب کے ساتھ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ (۷/۱۸۰) اور جو لوگ اس کی صفات میں (افراط و تفریط سے) کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں۔ ان سے کوئی واسطہ نہ رکھو۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں اعتدال پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ یعنی جو لوگ کسی ایک صفتِ خداوندی میں بھی، اعتدال کا دامن چھوڑ کر افراط اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ صحیح راستے پر نہیں۔ یہاں "الحاد فی الاسماء" کہا ہے سورہ حٰمٓ سجدہ میں الحاد فی الآیات۔ یعنی آیاتِ خداوندی میں بھی کسی ایک طرف نکل جانے کو باطل کی راہ کہا ہے (۴۱/۴۰)۔ مومن وہ ہیں جو صراطِ مستقیم پر چلتے ہیں۔ یعنی توازن بدوش راہ پر جس میں نہ افراط ہو نہ تفریط۔ یہی لوگ منعمِ علیہ ہیں۔ یعنی جنہیں زندگی کی تمام خوشگواریاں نصیب ہیں۔ اسی درخشندہ فہرست کا سرِ عنوان، مقامِ محمدیؐ ہے۔ جسے قرآن نے فاستویٰ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی صفاتِ خداوندی کو (علیٰ حدِ بشریت) پورے پورے اعتدال کے ساتھ لیے ہوئے۔

یہ ہوا سیرت کا کمال۔ اب آگے بڑھیئے۔ ارشاد ہے وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (۵۳/۷) افق کے معنی ——

علم کی بلندی

(Horizon) یا زمین کے آخری کنارے کے ہیں۔ اس میں وسعت کی انتہا آجاتی ہے اور جب اس کے ساتھ اعلیٰ کا لفظ آجائے تو اس میں وسعتیں اور بلندیاں دونوں شامل

...ہو... ہیں۔ آپ سطح زمین پر کھڑے ہوں تو آپ کی افق (وسعتِ نگاہ) بہت قریب ہوگی۔ آپ کسی اونچی ...ت پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو آپ کی افق کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ اور جب آپ کسی بلند ترین (اعلیٰ) مقام ...کھڑے ہوں تو یہ وسعت اپنی انتہا تک پہنچ جائے گی۔ لہٰذا ھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی سے مراد یہ ہے کہ نبی کا علم ...بی وسعتوں اور بلندیوں میں انتہا تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر نبی کے معنی "پیش گوئیاں کرنے والا یا خبریں دینے والا" کیئے جاتے ہیں (یعنی اسے نباء سے مشتق مانا جاتا ہے)، نبوت کا یہ تصور درحقیقت یہودیوں کے ہاں سے آیا ہے۔ ان کے ہاں ہیکل (معبد) میں ایک بلند منصب کا حامل نبی کہلاتا تھا جس کا کام لوگوں کو آنے والے واقعات کے متعلق خبریں دینا (یا ان کی قسمت کی تقدیر بتانا) تھا۔ چنانچہ یہودی لٹریچر میں جن نبیوں کے قصے درج ہیں، وہ بالعموم ہیکل کے نبی منصب داروں سے متعلق ہیں۔ انگریزی میں اس لفظ (نبی) کا ترجمہ (Prophet) ہوا یعنی —— پیش گوئیاں کرنے والا۔ لیکن قرآن کی رُو سے نبی کے معنی اس (Prophecies) سے مختلف ہیں۔ یہ لفظ نَبْوَةٌ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ لہٰذا نبی کے معنی ہیں وہ جو بلند مقام پر کھڑا ہو۔ ھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی یا اُفُقِ الْمُبِیْنِ (۸۱/۲۳) ان معانی کی وضاحت خود نبی اکرمؐ نے عملاً کر کے دکھا دی۔ جب آپ کو حکم ملا کہ خدا کا پیغام اپنے لوگوں تک پہنچائیں تو آپؐ مکہ سے باہر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ گئے اور لوگوں کو (بالخصوص اپنے اہل خاندان کو) بلایا۔ جب وہ جمع ہو گئے تو آپ نے ان سے کہا کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑی کی دوسری طرف ایک لشکر جرار ہے جو تم پر چڑھائی کرنے کے لیئے بڑھے چلا آرہا ہے تو تم میری بات کو سچ مانو گے یا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم اسے ضرور سچ مانیں گے۔ آپ نے پوچھا کہ تم اسے سچ کیوں مانو گے؟ انہوں نے کہا کہ ایک تو اس لیئے کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

نبی کے معنی

آگے بڑھنے سے پیشتر برادران! ذرا اس ٹکڑے پر پھر غور کیجئے کہ انہوں نے کہا کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ آپ نے کہا کہ ایک بننے والے نبی کی زندگی، نبوت سے پہلے بھی کس قسم کی ہوتی ہے؟ اس قسم کی کہ وہ اپنی قوم میں صادق اور امین مشہور ہوتا ہے۔ اس کی زندگی ایک پاکباز اور دیانتدار انسان کی زندگی ہوتی ہے۔ ایسی پاکباز اور دیانت دارانہ زندگی کہ وہ اسے اپنے دعوے کی صداقت کے لیے بطور شہادت پیش کرتا ہے چنانچہ جب نبی اکرمؐ نے نبوت کا دعوےٰ کیا تو آپ کی قوم نے کہا کہ آپ کوئی معجزہ دکھایئے تاکہ ہم یقین کر لیں کہ آپ واقعی خدا کے رسول ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِہٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶) میں تم میں کوئی اجنبی نہیں ہوں۔ میں کہیں باہر سے نہیں آیا کہ تم مجھے جانتے نہ ہو۔ میں نے اس دعوے سے قبل عمر تم میں بسر کی ہے۔ کیا تم اس کے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟ اگر تم ذرا بھی عقل و فکر

سے کام لو تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائے کہ جس شخص نے اپنی ساری عمر صداقت اور دیانت سے گذاری ہو کس طرح ممکن ہے کہ یہ ایک ہی رات میں یوں بدل جائے کہ اتنے بڑے جھوٹ اور فریب پر اُتر آئے! لہٰذا میری گذشتہ زندگی میرے دعوے کی صداقت پر دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔

ہاں! تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم آپ کی بات کا اس لیئے یقین کر لیں گے کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اور دوسرے اس لیئے کہ آپ اُس مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے آپ پہاڑی کے اس طرف بھی دیکھ سکتے ہیں اور اس طرف بھی۔ اور ہم اس جگہ ہیں جہاں سے ہم اس طرف دیکھ سکنے کے قابل نہیں۔

آپ نے فرمایا کہ یہی بات میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ مجھے خدا نے علم کی اس بلندی پر فائز کیا ہے۔ جہاں سے میں اُس دنیا کو بھی دیکھ سکتا ہوں جہاں سے حقائق کائنات اُبھرتے ہیں۔ اور اس دنیا کو بھی جہاں یہ منطبق (APPLY) ہوتے ہیں۔ اسے مقامِ نبوت یا وحیٔ خداوندی کہتے ہیں۔

یہی ہے برادرانِ عزیز! وہ اُفُقِ الاَعلیٰ جس پر نبی فائز ہوتا ہے۔ جہاں سے وہ اُس دنیا کو بھی دیکھتا ہے جو دوسرے انسانوں کی نگاہوں، بلکہ قیاس وخیال وگمان و وہم تک سے اوجھل ہے۔ اور اِس دنیا کو بھی جہاں انسان بستے ہیں۔ وہ علم کی ان بلندیوں پر ہوتا ہے۔

فکر و عمل میں مطابقت

اب اگلی آیت کی طرف آیئے! آپ دنیا کے بڑے بڑے فلاسفرز (مفکرین) کی زندگی کو دیکھئے۔ بالعموم آپ کو یہ نظر آئے گا کہ ان کے افکار (Thoughts) بہت بلند ہوں گے۔ وہ کائنات کے عظیم حقائق سے بحث کریں گے۔ لیکن ان حقائق کی جھلک اِن کی اپنی سیرت و کردار میں بہت کم دکھائی دے گی یعنی ان کی فکر، ان کے ادراک (Intellect) کی بلندی، اور ان کی عملی زندگی میں بہت بُعد ہوگا۔ لیکن نبی کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ وہ علم کے اُفقِ اعلیٰ پر فائز ہونے کے ساتھ عملاً بھی حقائقِ کائنات سے بہت قریب ہوتا ہے (ثُمَّ دَنَا ۵۳/۸) ان حقائق میں اور اس کی اپنی زندگی میں قطعاً بُعد نہیں ہوتا۔

حقائق کی گہرائیوں میں

زندگی کو ان حقائق سے ہم آہنگ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان حقائق کا صرف فکری اور نظری طور پر ہی ادراک نہیں کرتا بلکہ وہ ان کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے (فَتَدَلّٰی ۵۳/۸) وہ ضمیرِ کائنات کے عُمق (Depths) تک جا پہنچتا ہے۔

جوڈ (Joad) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی انسان میں علم کی وسعت ہو تو وہ مفکر (یعنی فلاسفر) ہوتا ہے اور اگر اس میں جذبات کی گہرائی ہو تو وہ تخلیقی نابغہ (Creative Genius) ہوتا ہے۔ قرآن کہتا

ہے کہ جس ذات میں علم کی بلندیاں، حقائق کی وسعتیں اور تخلیقی جذبات کی گہرائیاں اپنے انتہائی اعتدال کے ساتھ یکجا جمع ہوں، اُسے نبی کہا جاتا ہے۔

یہ ہے برادران! علم و جذبات و کردار کے اعتبار سے مقامِ محمدیؐ کی ایک جھلک جو قرآن کے ان درخشندہ موتیوں میں اس طرح جھلمل جھلمل کرتی دکھائی دیتی ہے۔

نبی کا فریضہ

اب یہ دیکھئے کہ اس قدر عظیم علم (وحی) پانے کے بعد نبی کا فریضہ کیا قرار پاتا ہے؟ اس کا منصب کیا ہوتا ہے؟ یہیں سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ نبی محض (معاذ اللہ) ایک آلۂ ابلاغ پیغام پہنچانے والا ریڈیو سیٹ) نہیں ہوتا۔ (اس کا مشن اس سے آگے کچھ اور بھی ہوتا ہے۔

آپ میں سے اکثر احباب، علامہ اقبال کے مجموعۂ خطبات (Lectures) سے واقف ہوں گے۔ انہوں نے اپنے پانچویں لیکچر کا افتتاح اس طرح کیا ہے۔

محمدِ عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔

یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (عبدالقدوس گنگوہی) کے ہیں۔ تصوّف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرے کے اندر شعورِ نبوّت اور تصوّف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجربہ گاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا۔ اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لیئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے تو اس کی یہ مراجعت — نوعِ انسانی کے لیئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت تخلیقی مقصد کے لیئے ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلّط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لیئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجربہ گاہ آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لیئے ایک صاحبِ وحی کے تجربے کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت اُبھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

(خطبات اقبال)

میں اس وقت، برادران! ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ تصوّف کی حقیقت کیا ہے اور جس چیز کو کشف والہ کہا جاتا ہے ان کی ماہیت کیا؟ ان امور کے متعلق میں اس سے پہلے متعدد مقامات پر لکھ چکا ہوں۔ اس وقت صر

تصوّف اور نبوت

اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ مقامِ نبوّت (فلک الافلاک کی بلندیوں) تک پہنچنا تو ایک طرف صوفی کا گذرانِ دوائر میں بھی نہیں ہو سکتا جن سے وحی کا نزول ہوتا ہے۔ صوفی کے تمام کمالات اس کے اپنے کسب و ہنر کا نتیجہ ہوتے ہیں اس کے برعکس نبوّت ایک یکسر وہبی عطیہ ہے۔ جس میں نبی کے اپنے کسب و ہنر دتو ایک طرف، اختیار و ارادہ کو بھی دخل نہیں ہوتا۔ جس چیز کو تصوّف کی دنیا میں روحانی ترقی سمجھا جاتا ہے۔ وہ دراصل انسان کی بعض نفسیاتی قوتوں کی بیداری اور نشو و نما ہوتا ہے۔ یہ اس کی اپنی داخلی قوتیں ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس وحی، خارج سے انکشافِ حقیقت کا نام ہے جسے نزول کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ صوفی اس مقام تک پہنچ کر جہاں سے نبی کو وحی ملتی ہے واپس آسکتا ہے یا نہیں جو وہاں پہنچ ہی نہیں سکتا، اس کی واپسی کا کیا ذکر؟ جس مقصد کے لیئے میں نے اس اقتباس کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب نبی پر انکشافِ حقیقت ہوتا ہے (یعنی اسے وحی ملتی ہے) تو اس سے مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ ان حقائقِ مستور کے پُرکیف مناظر سے ذاتی طور پر لذّت اندوز ہوتا رہے اور ان کی حیرت انگیز کیفیات میں اس قدر مستغرق ہو جائے کہ صوفیوں کی طرح اس کی بھی (معاذ اللہ) یہ حالت ہو جائے کہ

کاں راکہ خبر شد خبرش باز نہ آید

نبی کو وحی اس لیئے نہیں ملتی اُسے وحی اس لیئے ملتی ہے کہ وہ اسے لے کر انسانوں کی دنیا کی طرف آئے اور ظلم و استبداد

رسالت کا فریضہ

کی ان تمام طاغوتی قوتوں کو جو عالمِ انسانیت میں فساد برپا کر رہی ہوں، راستہ سے ہٹا کر انسانی معاشرہ کو قوانینِ خداوندی کے خطوط پر متشکل کر دے۔ بالفاظ دیگر، وہ عالمِ انسانیت میں خدا کے پروگرام کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف (داستانِ حضرت موسیٰ میں) یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے کہ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي (۲۰/۴۱)، ہم نے تجھے (اے موسیٰ۔ اس طرح) اپنی ذات کے لیئے تیار کیا۔ اس میں لِنَفْسِي کا ٹکڑہ قابلِ غور ہے۔ گویا خدا کا ایک پروگرام تھا جس کی تکمیل کے لیئے اس نے صاحبِ ضربِ کلیم کو اس طرح (درجہ بدرجہ۔ منزل بہ منزل) تیار کیا۔ وہ پروگرام کیا تھا؟ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۰/۴۳)، تم دونوں (حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون) فرعون کی طرف جاؤ۔ اس لئے کہ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے وہ حد سے نکل گیا ہے۔ یعنی ایک نبی کو وحی اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ مظلوم انسانیت کو مستبد اور سرکش قوتوں کے پنجہ آہنی سے چھڑا کر خدا کے قوانین کے تابع لے آئے۔ یہ نقطہ برادران! ذرا مزید وضاحت کا متقاضی ہے۔ آپ نظامِ کائنات پر غور کیجئے۔ وہاں ہر شے خود بخود قوانینِ خداوندی کے مطابق مصروفِ کار ہے جس کے

انسان اور کائنات میں فرق

سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ اس کی تکمیل کے لیے ہر وقت سرگرداں و جنباں ہے لیکن انسان کو چونکہ صاحبِ ارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لئے اسے یہ حاصل ہے کہ یہ چاہے تو قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے تو اس سے سرکشی اختیار کرکے دوسری روش پر چل نکلے۔ جب مستبد قوتیں قانونِ خداوندی کے راستے کو چھوڑ کر اپنے خود ساختہ قوانین کے مطابق نظام قائم کر لیتی ہیں۔ تو زیر دست انسان ان کے پاؤں تلے بُری طرح رُوندے جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ خدا کا قانونِ مکافات، ان سرکش قوتوں کے اعمال کے نتائج مرتب کر رہا ہوتا ہے۔ اور ان نتائج کو ایک دن ان کے سامنے بھی آنا ہوتا ہے۔ لیکن یہ کچھ خدا کے کائناتی قانون کے حساب و شمار کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن اگر خدا کے اس قانونِ مکافات کے ساتھ انسان کا ہاتھ بھی لگ جائے تو یہی نتائج انسانوں کے ماہ و سال کے حساب سے مرتب ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ اور جن سرکش قوموں نے صدیوں کے بعد جا کر تباہ ہونا تھا وہ دنوں میں سرنگوں ہو کر وجہِ نجاتِ انسانیت بن جاتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ جب انسان خدا کا رفیق بن جائے تو پھر خدا کے پروگرام (مشیت) کی تکمیل انسانی حساب و شمار کے مطابق ہو جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو دوسرے مقامات پر بانداز دگر بیان کیا گیا ہے۔ سورہ سجدہ میں ہے يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ۔ قانونِ خداوندی کے مطابق تدبیرِ اُمور کی صورت یہ ہے کہ (وہ اپنی) ہر اسکیم کو اس کے پست ترین نقطۂ آغاز سے بلند ہونا شروع ہوتی ہے۔ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲/۵) اور اس طرح اُوپر اٹھتی جاتی ہے (خدا کی طرف بلند ہوتی جاتی ہے) ایک ایک ارتقائی مرحلہ میں جس کی مقدار تمہارے حساب و شمار سے ہزار سال کی ہوتی ہے۔ اسی کو سورہ فاطر میں یوں کہا گیا ہے کہ — اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ خوشگوار نظریۂ حیات اُس کی طرف بلند ہوتا ہے۔ اس کا یہ بلند ہونا، خدا کے کائناتی قانون کے حساب و شمار کے مطابق ہوتا ہے (جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔) اس کے آگے ہے وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (۳۵/۱۰) اور عملِ صالح اسے رفعت عطا کر دیتا ہے۔ یعنی ویسے تو وہ خدا کے کائناتی قانون کے مطابق بلند ہوتا ہی ہے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ انسان کے اعمالِ صالح بھی شامل ہو جائیں یہ اس کی رفتار یا ترقی Speed or Progress کو تیز تر (Accelerate) کر دیتے ہیں انسان کی رفاقت کے بغیر وہ صرف اپنے زورِ دروں سے اُوپر چڑھتا تھا۔ اس کی رفاقت اسے خارجی قوت کا سہارا دے کر، جلد بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے۔ خدا اور انسان کا یہ حسین تعلق (یعنی رشتۂ رفاقت) وہ عظیم حقیقت ہے جس کی طرف نبیٔ اکرمؐ نے اپنی زندگی کے آخری سانس میں اِن الفاظ میں اشارہ فرمایا کہ بل الرفیق الاعلیٰ۔ خدا رفیق اعلیٰ ہے۔ یعنی اس پروگرام کی تکمیل میں انسان رفیقِ ادنیٰ ہوتا ہے اور خدا رفیقِ اعلیٰ لیکن تعلق ان کا رفاقت کا ہی

ہوتا ہے۔

اس پس منظر کی روشنی میں آگے بڑھیئے۔ عربوں میں قاعدہ تھا کہ جب دو دوست آپس میں گہری رفاقت کا معاہدہ کرتے تو وہ دونوں اپنی اپنی کمانیں ملاتے اس طرح کہ دونوں کا چلّہ ایک ہو جاتا۔ یعنی وہ کمانیں تو دو ہوتیں۔ لیکن ان کا چلّہ ایک ہوتا۔ اس چلّہ میں ایک تیر رکھتے۔ ان میں سے ایک کمان کو کھینچتا اور دوسرا چلّہ کو اور اس طرح دونوں مِل کر تیر چلاتے۔ اس محکم معاہدۂ رفاقت کو وہ قابِ قوسین (دو کمانوں کے ایک چلّہ) سے تعبیر کرتے۔

قابِ قوسین

قرآن نے کہا ہے کہ جب نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس میں شرفِ انسانیت کے مختلف عناصر یک جا جمع ہو کر اعتدال تک پہنچ گئے اور علم و حقائق کی دنیا میں آپ کو انتہائی بلندیاں وسعتیں اور گہرائیاں حاصل ہو گئیں تو اس کے بعد فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (۵۳/۹) آپ کا خدا کے ساتھ انتہائی رفاقت کا تعلق قائم ہو گیا یوں سمجھئے کہ رسول اللہ نے خدائی پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کا پختہ عہد دے دیا اس عہد و پیمان کے بعد وہ انسانوں کی طرف تشریف لائے۔ حالی کا سادہ اور حسین الفاظ میں، یہ داعیٔ انقلاب، تاجِ نبوت سے سرفرازی کے بعد۔

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے کہ نبوت اس منصب کو کہیں گے جس کی رُو سے نبی کو وحی ملتی ہے اور رسالت وہ منصب ہے جس کی رُو سے وہ وحی کی روشنی میں انسانی معاشرہ میں آسمانی انقلاب پیدا کرتا اور اس طرح عملاً وحی کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اس میں وہ قطعاً بخل نہیں برتتا وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ (۸۱/۲۴) اس اعتبار سے نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو گوشے اور ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایک ہی شخصیت کو کہیں نبی کہہ کر پکارا ہے اور کہیں رسول کہہ کر۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ نبی اسے کہتے ہیں جو صاحبِ کتاب نہ ہو اور رسول اسے جسے کتاب ملی ہو۔ قرآن سے یکسر لاعلمی کی دلیل ہے قرآن کی رُو سے ہر نبی یعنی ہر رسول کو کتاب ملتی تھی۔ (دیکھئے ۲/۲۱۳، ۵۷/۲۵)

ہاں تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ ایک نبی، وحی کی جگمگاتی قندیل کو ہاتھ میں لیئے، دنیائے انسانیت کی طرف آتا ہے تاکہ انسانی معاشرہ کو کائناتی قوانین سے ہم آہنگ کر کے، خدا کے پروگرام کی تکمیل کرے۔ اور جس طرح اس کی بادشاہت آسمانوں (خارجی کائنات) میں ہے اسی طرح زمین پر بھی اس کی حکومت قائم ہو جائے۔ اس طرح رسول اور اس کے ساتھی خدا کے انصار اور رفیق بن جاتے ہیں۔ اب جو کام اُن کے ہاتھوں سے سرزد ہوتے ہیں۔ انہیں خدا خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ (مثلاً) جنگِ بدر میں جو تلواریں محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے اُٹھیں اور جو تیر ان کی کمانوں سے نکلے ان کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ وہ کچھ خود ہمیں نے کیا تھا۔ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸/۱۷) تم نے انہیں قتل نہیں کیا

نے قتل کیا ہے۔ تم نے ان پر تیر اندازی نہیں کی۔ خود اللہ نے کی ہے۔ برادرانِ عزیز! غور کیجئے کہ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی کی کیسی دلنشین پیرایہ میں تشریح کی گئی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے غالب نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ۔

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است لیکن کشودِ آں زکمانِ محمدؐ است

مقامِ رسالت کی اس سے بہتر انداز میں تصویر کشی شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

مقامِ عبدیت

علم و عمل کے ان تمام بلند ترین گوشوں کو سامنے لانے کے بعد، قرآن نے کہا ہے کہ فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی (۵۳/۱۰) جب یہ عبد (نبی اکرمؐ) اس مقام تک پہنچ گیا تو پھر خدا نے اسے وحی کی خلعت سے سرفراز کیا! یہ مرتبۂ بلند ہر کسی کو نہیں مل جایا کرتا۔ اتنی عظیم خصوصیات کا حامل ہوتا ہے وہ سینہ جسے وحی کا مہبط بننا ہوتا ہے۔ آپ نے غور کیا برادران! کہ قرآن نے حضورؐ کے لیے عبدہٖ کا لفظ اس مقام پر جا کر استعمال کیا ہے۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مقامِ عبدیت کیا ہے؟ یہ وہ مقام ہے جس کے تصور سے نگاہوں میں چمک، ذہن میں جلا اور قلب میں نور پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ اکبر۔ کتنا بلند ہے مقامِ عبدیت۔ آپ دیکھئے گا کہ قرآن نے جہاں نزولِ وحی کا ذکر کیا ہے وہاں عام طور پر عبد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ (۱۸/۱) تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ (۲۵/۱) ھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِہٖٓ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ (۵۷/۹) اسی لیے قرآن نے ہر رسول کو عبد کہا ہے۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ ایک شخص خواب میں کچھ محیر العقول باتیں دیکھتا ہے۔ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خواب میں دیکھے ہوئے مناظر پر خود ہی ہنس دیتا ہے اس لئے کہ اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ ایسی باتیں کبھی فی الواقعہ صحیح نہیں ہو سکتیں۔ قرآن کہتا ہے کہ نبی جن حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے یعنی جو علم اُسے وحی کی بناء پر حاصل ہوتا ہے وہ خواب کا سا علم نہیں ہوتا کہ آنکھیں دیکھیں اور دل اس کی تردید کرے۔ اس کا دیکھنا علم و یقین کا دیکھنا ہوتا ہے۔

دل کی تصدیق

جو کچھ وہ دیکھتا ہے اس کا دل اس کی کبھی تکذیب نہیں کرتا۔ وَمَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی (۵۳/۱۱) یہی وجہ ہے کہ نبی اپنی وحی پر سب سے پہلے خود ایمان لاتا ہے اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۲/۲۸۵) جو کچھ اس کے رب کی طرف سے اس پر اتارا جاتا ہے رسول (سب سے پہلے) اس پر ایمان لاتا ہے اور پھر باقی مومنین۔ اس لئے رسول کا اعلان یہ ہوتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ میں سب سے پہلے اپنی وحی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

قرآن نے اس پر ایمان کے لیے دل کی شہادت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس حقیقت کو اس نے سورہ منافقین

میں ایک اور انداز سے بیان کیا ہے۔ سورت کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ (اے رسول) جب منافق تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں تو یقیناً اللہ کا رسول ہے اس کے بعد ہے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ اور اللہ کو اس کا علم ہے کہ تو یقیناً اس کا رسول ہے اس سے ظاہر ہے کہ منافقین ایسی بات کہتے ہیں جو امرِ واقعہ ہے اور جس کی شہادت خود اللہ دے رہا ہے اس لیئے منافقین کے سچا ہونے میں بظاہر کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ لیکن اس کے آگے ہے کہ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (۶۳/۱) اور اللہ اس کی بھی شہادت دیتا ہے کہ یہ منافقین یقیناً جھوٹے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے یہاں کتنی بڑی حقیقت بیان کی ہے اور کیسے دلنشین پیرایہ میں۔ اس نے کہنا یہ ہے کہ منافقین زبان سے جو کچھ کہتے ہیں وہ تو بالکل سچی حقیقت ہے لیکن چونکہ ان کا دل اس کی شہادت نہیں دیتا اس لئے یہ جھوٹے ہیں اس سے قرآن نے کذب کی ایک واضح اور محکم تعریف (Definition) بیان کر دی ہے یعنی جب تک کسی کا قلب اور زبان ہم آہنگ نہ ہو، اسے سچا نہیں کہہ سکتے۔ کذب وہ ہے جس میں قلب اور زبان میں ہم آہنگی نہ ہو۔ ایک شخص زبان سے ایک ایسی بات کہتا ہے جو بالکل سچی ہے۔ لیکن اگر اس کا دل اس کی تصدیق نہیں کرتا تو وہ کاذب ہے۔ صادق نہیں ہے اقبال کے الفاظ میں۔

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الٰہ الا
لغتِ غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

ایمان یہ ہے کہ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (۵۳/۱۱) جو کچھ آنکھیں دیکھیں دل اس کی تکذیب نہ کرے نبی اپنی وحی پر اسی طرح ایمان لاتا ہے۔ وہ حقائق کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اس کا دل ان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کے بعد قرآن ضمناً ان لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے جو نبی کی اس وحی کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تم ہمیشہ کہتے یہ ہو کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ لیکن عملاً تمہاری حالت یہ ہے کہ تم رسول سے اس بات پر جھگڑتے ہو جسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بیان کرتا ہے اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى کتنی بڑی ہے تمہاری بھول اور کس قدر غیر معقول ہے تمہاری یہ مخالفت! اس ضمنی گوشے کے بعد قرآن پھر اسی موضوع پہ آجاتا ہے اور اگلی آیت میں ایک اور عظیم حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔

وحی اور خواب

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ وحی خواب نہیں ہوتا۔ حقیقت کا عینی مشاہدہ ہوتا ہے۔ اسی چیز کو اس نے باندازِ دگر بیان کیا ہے۔ خواب کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ آپ کسی خواب کو ان کی تفاصیل جزئیات۔ ربط اور تسلسل کے ساتھ کبھی دوبارہ نہیں دیکھ سکتے یہ نفسیاتی ناممکنات میں سے ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ نبی کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اُسے خواب مت سمجھو۔ اس لیے کہ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (۵۳/۱۳) اس نے اُسے بارِ دگر بھی دیکھا ہے اور فی الحقیقت (لَقَدْ رَاٰهُ) دیکھا ہے۔ اس لیئے اس کا یہ دیکھنا خواب نہیں۔ جو لوگ وحی کو خواب پر محمول کرتے ہیں۔ یا خوابوں کو از قبیل وحی تصور کرتے ہیں انہیں دیکھنا چاہیئے کہ یہ ان کی کتنی بڑی غلطی ہے۔ وحی خواب نہیں ہوتا۔ حقیقت کا یقینی مشاہدہ ہوتا ہے اور بار بار ہوتا ہے۔

...قرآن وحی کے ایک اور بنیادی گوشے کو سامنے لاتا ہے۔ ایک طرف جذبات پرست ہیں جو خوابوں کو بھی از قبیلِ ...تے ہیں دوسری طرف عام مفکّرین (فلاسفرز) ہیں جن کا خیال ہے کہ وحی، انسانی فکر ...بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے برگساں نے وجدان (Intuition) کے متعلق کہا ہے کہ وہ فکری کی (Higher Form of Intellect) ہے چنانچہ بعض لوگ وجدان کو وحی پر محمول کر لیتے ...ی مفکّرین کا رجحان اسی طرف ہے، قرآن نے جہاں اس تصوّر کی تردید کی ہے کہ خواب بھی وحی ہوتے ہیں وہیں ...میں اس کا بھی اعلان کر دیا کہ وحی فکرِ انسانی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام نہیں، وحی کا مقام وہ ہے جہاں عقلِ انسانی کے لئے حیرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَهٰی (۵۳/۱۴) نبی نے ان حقائق

...رۃ المنتہی

کو سدرۃ المنتہی کے قریب دیکھا۔ عربوں میں اَلسَّادِرُ اُس شخص کو کہتے ہیں جو شدّت گرمی کی ...سے متحیر ہو جائے۔ سَدِرَ بَصَرُہٗ سَدَرًا کے معنی ہیں گرمی کی شدّت کی وجہ سے اس کی نگاہیں حیران و ششدر ...گئیں۔ اس لیئے نبی کو جس مقام سے وحی ملتی ہے وہاں عقل انسان کے لیئے سوائے تحیّر کی فراوانیوں کے اور کچھ ...یں ہوتا۔ انسانی عقل وہاں ششدر و حیران رہ جاتی ہے۔ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں کہ وہ اس مقام اور اس ...کیفیات کا مشاہدہ یا اندازہ کر سکے۔

لیکن اگر عقلِ انسانی مقامِ وحی کی کُنہ وحقیقت کو نہیں سمجھ سکتی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ عقل وحی کے حقائق سے ...مستفید بھی نہیں ہو سکتی۔ وحی کی تعلیم انسان کی سمجھ میں آسکتی ہے اس لئے قرآن نے بار بار فکر و تدبر اور عقل و شعور ...سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ اس تعلیم کا سمجھنا اس لئے ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور اس پر عمل کرنا اس ...لئے ضروری ہے کہ اس دنیا میں بھی جنّتی معاشرہ قائم ہو سکے اور اس کے بعد کی زندگی بھی جنّت کی ہو۔ لہٰذا وہی ...عقل جو مقامِ نبوّت کی کُنہ وحقیقت سمجھنے سے یکسر قاصر ہے وہ اگر وحی کے پیغام کی اتّباع کرے تو جنّت کی خوشگواریاں ...اس کے حصّے میں آسکتی ہیں اس لئے کہ مقامِ وحی اگر عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَهٰی ہے تو عِنۡدَهَا جَنَّۃُ الۡمَاۡوٰی (۵۳/۱۵) جنّت بھی اُسی کے پاس ہی ہے جو شخص عقل کی رُو سے مقامِ نبوّت کو اپنے حیطۂ ادراک میں لانے کی سعیٔ لاحاصل ...کرتا ہے اس کے حصّے میں حیرت کی فراوانیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن جو شخص عقل و بصیرت کی رُو سے وحی کے ...پیغام کو عملی نظام میں متشکّل کرتا ہے وہ اپنے آپ اور اپنے ساتھ باقی انسانیّت کو جنّت کی آغوش میں لے آتا ہے۔ ...جہاں وہ اضطراب باقی نہیں رہتا جو عقل کی نارسائی کی وجہ سے قدم قدم پر اس کے لئے وجہِ خلش بنتا تھا، یہی وجہ

...ے اَلسَّدِيۡرُ پانی کے منبع اور سرچشمہ کو بھی کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے سدرۃ المنتہیٰ کے معنی علمِ الٰہی کے ہوں گے جو تمام ...حقائق کا سرچشمہ ہے۔ اگر سدرۃ المنتہیٰ کے معنی علمِ الٰہی کے لیے جائیں تو عِنۡدَهَا جَنَّۃُ الۡمَاۡوٰی سے مراد یہ ہو ...کہ جن قوموں کی کشتِ عمل وحیٔ الٰہی کے پانی سے سیراب ہو، وہ جنّت کی مالک ہوں گی۔

ہے کہ اہل جنت کے متعلق کہا ہے کہ وہ فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (۵۶/۲۸) ہوں گے یعنی ان "بیریوں" کے نیچے جن کا سایہ آرام دہ اور پھل خوشگوار ہوں گے۔ لیکن جن میں کانٹے نہیں ہوں گے۔ ایسی حیرت جس میں شکوک کی خلش نہ ہو بہرحال وحی کا مقام وہ ہے جہاں عقلِ انسانی بار ہی نہیں پا سکتی۔ جہاں عام انسان کی آنکھ کے لیے ہر طرف تحیّر ہی تحیّر ہوتا ہے۔ لیکن نبی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب ان تحیّر کی وادیوں پر ہر طرف سے علم الٰہی چھایا ہوا ہوتا ہے (اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی ۵۳/۱۶) تو اس کی آنکھ اس مقام پر بھی ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہوتی۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ (۵۳/۱۷) وہ ذرا نہیں بھٹکتی۔ غور کیجئے کہ عقل انسانی اور نگہِ نبوی میں کتنا عظیم فرق ہوتا ہے یہ فرق درجہ (DEGREE) یا کمیت کا (Quantitative) نہیں ہوتا۔ یعنی یہ نہیں کہ ایک ذرا نیچے ہے اور دوسری ذرا اُوپر۔ یہ فرق اصل دنیا کا فرق ہوتا ہے کمیت کی بجائے کیفیت کا (Qualitative) ہوتا ہے۔ عقلِ انسانی، کسب و ہنر سے اُس مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ لیکن اُس مقام سے ملے ہوئے پیغامات سے نفع یاب ہو سکتی ہے۔ یہ تو ہے نگہِ نبوت کا تقابل عقلِ انسانی سے۔ یعنی عقلِ انسانی کے مقابلہ میں نبوت حدود فراموش ہوتی ہے۔

علمِ نبوی کی حد

لیکن جب اس کا مقابلہ علمِ خداوندی سے کیا جائے تو علمِ نبوی لامحدود اور لانتہا نہیں ہوتا۔ نبوت کی آنکھ اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ جو اس کے لیے علمِ خداوندی نے مقرر کر رکھی ہو۔ اس لیے مَا زَاغَ الْبَصَرُ کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وَمَا طَغٰی (۵۳/۱۷) وہ نگاہ جس تحیّر کی ان فراوانیوں کے باوجود ذرا اپنے مقام سے اِدھر اُدھر نہیں ہوئی۔ وہاں وہ اس حد سے بھی تجاوز نہیں کر سکی جو اس کے لیے متعین تھی۔ اس لیے کہ نبی کا علم (وحی) کتنا ہی بلند اور وسیع کیوں نہ ہو وہ بہرحال، خدا کا عطا کردہ اور علمِ خداوندی کے مقابلہ میں محدود ہوتا ہے۔ انسانوں کے مقابلے میں، وحی کا مقام وہ ہے جہاں انسانی علم و عقل کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں لیکن علمِ خداوندی کے مقابلہ میں لاانتہا نہیں۔

مقامِ نبوت کے متعلق ان تصریحات کے بعد، قرآن چند لفظوں میں بتاتا ہے کہ نبی اس مقام بلند پر پہنچ کر دیکھتا کیا ہے؟ اس مقام پر قرآن نے وحی کی تفاصیل کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے کہ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی (۵۳/۱۸) اس نے اس مقام پر اپنے نشوونما دینے والے کی آیاتِ کبریٰ (عظیم نشانیوں) کو دیکھا۔ ان آیاتِ کبریٰ سے مراد کیا ہے؟ اس کے لیے پھر داستانِ حضرت موسےٰ کی طرف آیئے۔ جب حضرت موسیٰ کو طور کی چوٹیوں پر وحی سے نوازا گیا تو ان سے کہا گیا کہ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا ہے کہ لِنُرِیَکَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْکُبْرٰی (۲۰/۲۳) تاکہ ہم تجھے اپنی آیاتِ کبریٰ دکھائیں اس کے بعد ہے اِذْہَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی (۲۰/۲۴) فرعون کی طرف جا کیونکہ وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے وہ حد سے تجاوز کر رہا ہے

آیاتِ کبریٰ

اس سے ظاہر ہے کہ وحی پانے کے بعد، نبی کے سامنے پروگرام یہ ہوتا ہے کہ وہ سرکش قوتوں کو ان کے ظلم و استبداد سے روکے اور مظلوم انسانیت کو ان کے دندانِ حرص و آز سے چھڑائے۔ وہ اس مقصدِ عظیم کو لے کر اٹھتا ہے اور طاغوتی قوتوں کو، قیامت خیز تصادمات کے بعد، شکست دے کر قوانینِ خداوندی کے مطابق معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرتا ہے ان سرکش و مستبد قوتوں کی اس طرح سے شکست اور ان کے غاصب و ظالم نظام کی جگہ، خدا کے نظامِ ربوبیتِ عالمینی کا قیام، وہ آیاتِ کبریٰ ہیں۔ جن کا مشاہدہ نبی کو کرایا جاتا ہے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! قرآن کی روشنی میں نبی کا مقام اور یہ ہے وہ فریضۂ عظیم جس کی ادائیگی کے لیے اسے اس منصبِ جلیلہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا۔ کہ نبی کا کام خدا سے وحی پا کر انسانوں تک پہنچا دینا ہی نہیں ہوتا بلکہ وحی کی روشنی میں، نظامِ خداوندی کا قیام بھی ہوتا ہے۔ اور یہ مقصد بہت بلند اور یہ فریضہ بڑا اہم ہوتا ہے۔

نبوت، نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گئی لہٰذا حضورؐ کے بعد کوئی شخص خدا کی طرف سے وحی نہیں پا سکتا۔ لیکن اس وحی کی روشنی میں نظامِ خداوندی کا قیام اور اس کے قیام کے بعد اس کا تسلسل و استحکام وہ فرائض ہیں جو حضورؐ کی تشریف براری کے بعد، اُمّت کے سپرد ہوئے۔ حضورؐ کے بعد اُمّت نے کچھ وقت تک اس فریضہ کو سر انجام دیا۔ لیکن اس کے بعد بدقسمتی سے یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی اور نظامِ خداوندی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب اُمّت کا کام یہ ہے کہ اتباعِ نبویؐ میں پھر سے اُسی نظام کو قائم کرے تاکہ خدا کا دین متمکن ہو جائے اور جنت سے نکلا ہوا آدم پھر سے فردوسِ گم گشتہ کو پا لے۔

یاد رکھیئے برادران! انسان جو جی میں آئے کر کے دیکھ لے اس کی نجات و سعادت کی صرف ایک راہ ہی ہے یعنی وہ راہ جو مقامِ محمدیؐ (وحی) پر ایمان سے متعین ہوتی ہے اور جس کی طرف پیامِ محمدیؐ (قرآن) راہ نمائی کرتا ہے۔

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

ضرورت رشتہ

قرآنی گھرانے کی ایک لیڈی ڈاکٹر کے لیے، جس نے ۳ سال قبل ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا تھا، موزوں ڈاکٹر / انجنیئر کے رشتہ کی تلاش ہے۔

مکمل کوائف اور تصویر کے ساتھ مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ کریں۔

رابطہ بمعرفت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام، B-25 گلبرگ II لاہور - ۱۱

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

(مسلسل)

ایمان باللہ سے مُراد

اب شق دوم کی طرف آیئے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ، رُسل، کُتب پر ایمان لانے سے مفہوم کیا ہے؟ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان سے مقصود اطاعت ہے۔ اللہ پر ایمان لانے سے مفہوم یہ ہے کہ اس کے احکامات کا اِتباع کیا جائے۔ (اَطِیْعُوا اللّٰہَ) محض اللہ کی ہستی کا اقرار کر لینا ایمان نہیں کہلا سکتا۔ دنیا میں چند دہریوں کے سوا، کون ہے جو اللہ کی ہستی کا قائل نہیں۔ نام میں اختلاف ہوگا، تعیّنِ صفات میں اختلاف ہوگا، لیکن اس کی ذات کا اقرار تو ہر جگہ ملے گا۔ سو اگر ایمان سے مراد فقط اللہ کی ذات کا اقرار ہوتا تو قرآن کریم ان لوگوں کو کافر کیوں کہتا جو خدا کی ہستی کا اقرار کرتے تھے۔ قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر اس کی تصریح موجود ہے۔ کہ جب ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ بارش کون برساتا ہے؟ ہوائیں کون چلاتا ہے تو یہ جواب میں کہیں گے کہ اللہ! لیکن اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ حیرت ہے کہ اس اقرار کے باوجود یہ لوگ ایمان نہیں لاتے (۲۹/۶۳-۶۱)۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایمان کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کا ان تمام تفصیلات کے ساتھ اقرار جو قرآن میں مذکور ہیں۔ (۲۳/۹۰-۸۴)۔ اور اس کے ساتھ اس کے احکامات کی اطاعت، یہ ہے ایمان باللہ کا قرآنی مفہوم۔ چونکہ خدا کے احکام حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے ملتے ہیں۔ اور خدا کی وحی میں محفوظ ہوتے ہیں، اس لئے اللہ پر ایمان کے ساتھ اس کے انبیاء اور کتب پر ایمان کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ اس سے بھی یہی مفہوم ہے کہ احکاماتِ خداوندی کی اطاعت کی جائے۔ خود قرآن کریم کے متعلق فرمایا۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ (۷/۳)

جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیاء کی پیروی مت کرو۔

دین کا مدار ہی اطاعت پر ہے۔ خالص اور بے لوث خدا کی اطاعت۔ قرآن سے پیشتر کی کتابوں کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی۔ وہ کتابیں ضائع ہوگئیں، محرف ہوگئیں، یا ساقط العمل قرار پاگئیں۔ ان کی اطاعت بھی ختم ہوگئی۔ اور جب کتاب ہی اپنی اصلی شکل میں نافذ العمل نہ رہی تو اس کے لانے والے رسول کی رسالت کا زمانہ بھی ختم ہوگیا۔ ان سب کے بعد نبیٔ آخر الزمانؐ تشریف لائے جن پر نازل شدہ کتاب (قرآن کریم) اپنی اصلی شکل میں قیامت تک کے لیے نافذ العمل ہے۔ اس لیے اب اللہ اور اس کے رسول پر ایمان (یعنی اطاعت) قرآن کریم کے اتباع میں مضمر ہے۔ اب نبی اکرمؐ سے پیشتر کے رسولوں، اور قرآن کریم سے پہلے کی کتابوں پر ایمان سے مفہوم یہ رہ گیا کہ وہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کے سچے پیغامبر اور ان کے پیغامات خدا کے سچے احکام تھے۔ اب وہ تمام احکام قرآن کریم کے اندر آچکے ہیں۔

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (۵/۴۸)

اور ہم نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری جو پہلی کتابوں (کے دعاوی کو) سچا کر کے دکھانے والی اور ان (سچائیوں) کی محافظ ہے۔

اس لیے ایک نئی کتاب آجانے کے بعد پرانی کتاب کی اطاعت کچھ معنی نہیں رکھتی۔ ضابطۂ قوانین کے ہر نئے ایڈیشن میں جدید اضافوں کے علاوہ سابقہ ایڈیشن کی وہ تمام چیزیں بھی آجاتی ہیں جن کا نافذ العمل رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا زندہ قانون اسی آخری ایڈیشن کا سمجھا جاتا ہے۔ بنا بریں قرآن کریم کے بعد، مختلف اہلِ مذہب (یا اہلِ کتاب) کا اپنے اپنے ہاں کی سچائیوں (یعنی اپنے اپنے مذہب کی کتابوں) پر کاربند ہو کر زندگی بسر کرنا، اصولاً غلط ہے۔ اب "سچائیاں" (ان کے ہاں کی اور ان کے علاوہ وہ تمام جن کی نوعِ انسانی کو ضرورت ہے) صرف قرآن کریم کے اندر ہیں۔ چونکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ہر نئے رسول اور ہر نئی کتاب کے آنے پر اسی رسول اور اسی کتاب کا اتباع ضروری ہوتا تھا، اس لیے ہر رسول سے یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ اپنی امت سے کہہ دیں کہ جب رشد و ہدایتِ آسمانی کے اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی آجائے، جس کے بعد کوئی اور رسول اور کوئی اور کتاب نہ آئے گی، تو تم سب کو اس آخری کڑی کا اتباع کرنا ہوگا۔ سورۂ اعراف کے

انیسویں رکوع میں دیکھئے۔ حضرت موسیٰ دُعا مانگتے ہیں کہ بارِالٰہا! تو نے اس قوم (بنی اسرائیل) پر اپنی نوازشات کو یوں عام کیا ہے تو اس سلسلہ کو اسی طرح جاری رکھیو۔ ارشاد ہوتا ہے کہ بیشک ہماری رحمتیں بے پایاں اور ہر شے پر چھائی ہوئی ہیں، لیکن ہمارے نظامِ رشد و ہدایت کے مطابق یہ صرف ان کے حصہ میں آسکیں گی جو ہمارے آخری نبی اور آخری کتاب پر ایمان لائیں گے۔ یعنی ان کا اتباع کریں گے۔

فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ..... اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۷/۱۵۶-۱۵۷)

وہ رحمت، میں ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو قانونِ خداوندی کی نگہداشت کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے اور ہماری آیات (احکام) پر ایمان لائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جو نبی اُمّی کا اتباع کریں گے جسے وہ تورات و انجیل میں لکھا ہوا پائیں گے۔ وہ انہیں نیک باتوں کا حکم دے گا۔ بُری باتوں سے منع کرے گا پاکیزہ چیزیں ان کے لیے حلال کرے گا۔ ناپاک چیزیں حرام کرے گا۔ اور وہ طوق و سلاسل جو ان پر پڑے ہوئے ہوں گے ان کو ان سے الگ کرے گا۔ جو لوگ اس نبی پر ایمان لائیں گے اور اس کی عزت کریں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو اس کے ساتھ نازل کیا جائے گا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔

غور کیجئے کہ فلاح و سعادت کے لیے قرآن کریم نے کیا شرط لازم قرار دی ہے؟ نبیٔ اکرمؐ پر ایمان اور قرآن کریم کا اتباع اسی کا نام اسلام ہے۔ یہاں صرف حضرت موسیٰؑ کے متعلق ارشاد ہے۔ دوسرے مقام پر تمام انبیائے کرام کے متعلق بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ ..... وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (۳/۸۱-۸۵)

جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا تھا کہ ہم نے تمہیں کتاب و حکمت عطا فرمائی ہے۔ پھر جب تمہارے پاس وہ رسول آئے جو مصدق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے، تو تم نے ضرور اس پر ایمان لانا اور اس کی تائید کرنا۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا؟ اور اس پر میرا عہد قبول کیا؟ انہوں نے کہا، بے شک ہم اقرار کرتے ہیں۔ اس پر اللہ نے کہا کہ اس پر گواہ رہنا۔ اور دیکھو تمہارے ساتھ میں بھی اس پر گواہ ہوں۔ تو اب جو کوئی اس عہد و اقرار کے بعد اس سے رُوگردانی کرے گا تو یقیناً ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین چھوڑ کر کوئی دوسری راہ ڈھونڈ لیں! حالانکہ آسمان و زمین

میں جو کوئی بھی ہے طوعاً وکرہاً سب اللہ کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ اور بالآخر سب اسی طرف لوٹنے والے ہیں۔

اے رسول تم کہہ دو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر جو ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ واسحٰقؑ ویعقوبؑ کی اولاد پر نازل ہوا ہے اور اس پر بھی جو موسیٰؑ وعیسیٰؑ اور تمام انبیاء کو دیا گیا ان کے ربّ کی طرف سے۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے۔ اور ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔ تو دیکھو جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کی طلب کرے گا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور آخرت میں اس کی جگہ ان لوگوں میں ہوگی جو تباہ و نامراد ہوں گے۔

انبیاء سے عہد لینے سے مطلب یہ ہے کہ ان کی وساطت سے، ان کی امتوں سے عہد لیا گیا تھا۔ چنا کتبِ سماوی کے جو بچے کھچے حصے کہیں آج بھی موجود ہیں، ان میں اس امر کی طرف اشارات ملتے ہیں کہ انبیاء رشد و ہدایت کے اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی (یعنی نبیٔ آخر الزمانؐ) پر ایمان لانے کی تلقین کر تھے، کیونکہ یہی اس نظامِ خداوندی کا تقاضا تھا۔ لہٰذا نبیٔ اکرمؐ کے تشریف لے آنے کے بعد، حضورؐ پر کے بغیر نجات وسعادت کی کوئی راہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم تفریق بین الرسل (رسولوں ایک دوسرے میں فرق کرنے) کو پکا کفر قرار دیتا ہے۔ (۴/۱۵۰)

شق دوم سے ظاہر ہے کہ:-

(۱) رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے سے مفہوم صرف انہیں مان لینا نہیں بلکہ ان کی اطاعت کرنا ہے۔

(۲) تفریق بین الرسل کفر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام رسول اپنے اپنے وقت میں اللہ کی طرف سے پیغامِ رشد و ہدایت لاتے رہے اور اپنے اپنے وقت میں ان کی اطاعت فرض تھی۔

(۳) نبیٔ اکرمؐ پر ایمان لانے کے بھی یہی معنی ہیں کہ قرآن کی اطاعت کی جائے۔ اور چونکہ حضورؐ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔ اس لیے قرآن کی اطاعت قیامت تک کے لیے ہے اور تمام نوع انسانی کے لیے ہے۔

(۴) اب جو شخص، خدا، اس کے رسولوں اور کتابوں پر اس طرح ایمان لائے گا جس طرح

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ (۲/۱۳۷)

پس اگر یہ لوگ اس پر اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لاتے ہو تو پھر یہ لوگ راہ ہدایت پر ہوں گے اور اگر یہ اس سے پھر جائیں گے تو پھر یہ مخالفت کی راہ ہو گی۔

ایمان بالرسالت سے مفہوم

کہا جاتا ہے کہ جو لوگ تمام مذاہب کو یکساں قرار دیتے ہیں۔ وہ محمد رسول اللہؐ کی سچائی کا بھی اقرار کرتے ہیں۔ اس لیے یہ تفریق بین الرسل نہیں یعنی وہ حضورؐ کو بھی خدا کا سچا رسول مانتے ہیں۔ چنانچہ خود جناب آزاد نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے خدا کی توحید کے ساتھ حضورؐ کے درجۂ رسالت وعبودیت کا اقرار بھی ضروری ہے۔ (صفحہ ۱۱۹)

یعنی جناب آزاد کے نزدیک

(۱) دوسرے انبیاء اکرام کی طرح نبی اکرمؐ پر ایمان تو ضروری ہے۔

لیکن

(۲) نجات وسعادت کے لیے اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر کاربند ہونا ہی کافی ہے۔

یعنی ان کے نزدیک صورتِ حال یوں ہوئی کہ جس طرح مسلمان حضرت موسیٰؑ وعیسیٰؑ و دیگر انبیائے کرام علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ منجانب اللہ تھے، لیکن اتباع صرف اس کتاب کا کرتے ہیں جو محمد رسول اللہ کو ملی تھی، اسی طرح اگر عیسائی اور موسائی محمد رسول اللہؐ کو منجانب اللہ سمجھ لیں، لیکن اتباع اپنے ہی مذہب کا کرتے رہیں تو اسلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اس غلط فہمی کی بنیاد اس اصل پر ہے کہ ان حضرات کے نزدیک محمدؐ رسول اللہ پر ایمان سے مفہوم فقط اتنا ہے کہ آپ کے متعلق یہ اقرار کر لیا جائے۔ کہ آپ منجانب اللہ رسول تھے اور بس۔ حالانکہ شق دوم میں، قرآن کریم کی نصوص صریحہ سے واضح کیا جا چکا ہے کہ جب انبیائے سابقہ (علیہم السلام) اور نبی اکرمؐ (یا کتب سابقہ یا قرآن کریم) کے متعلق ایمان کا لفظ بولا جائے گا تو اس کے قرآنی مفہوم (میں) ایک بنیادی فرق ہو گا۔ یعنی ایک نئے نبی کے آنے کے بعد سابقہ نبی، یا نئی کتاب کے نازل ہونے کے (بعد پہلی) کتاب پر ایمان کے معنی فقط اتنے ہوں گے کہ وہ نبی یا وہ کتاب اپنے وقت میں منجانب اللہ تھی۔ اور

اس نئے نبی اور نئی کتاب کے متعلق ایمان سے مفہوم یہ ہوگا کہ انہیں منجانب اللہ مانا جائے اور ان کی اطاعت بھی کی جائے، جس طرح ایک جدید وائسرائے کے آنے کے بعد اس کے پیش رو کے متعلق فقط اتنا ماننا ضروری رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت میں بادشاہ کا جانشین تھا لیکن اطاعت اس جدید وائسرائے کے ذریعہ دیئے ہوئے احکام ہی کی لازم ہوگی۔ لہٰذا جب مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہم تمام انبیائے سابقہ پر ایمان لاتے ہیں تو اس سے مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہم اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ تمام حضرات اپنے اپنے وقت میں اللہ کے پیغامات کے حامل اور باذن اللہ مطاع تھے۔ لیکن نبی آخر الزمان کی تشریف آوری کے بعد اطاعت فقط قرآن کریم کی باقی رہ گئی، اسی لیے اس کے اندر تمام سابقہ کتب کی سچائیاں جمع کر دی گئی ہیں اور اس پر جدید احکامات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ لہٰذا تفریق بین الرسل سے صرف اتنا ہی مفہوم نہیں کہ اس امر کا زبانی اقرار لیا جائے کہ تمام انبیائے سابقہ (مع نبی اکرمؐ) منجانب اللہ رسول تھے بلکہ اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمام انبیائے سابقہ کی رسالت کے اقرار کے ساتھ، اطاعت خدا کی آخری کتاب کی کیجائے۔ اگر نبی اکرمؐ کی رسالت کا زبانی اقرار ہو اور اطاعت اپنے اپنے مذہب کی کی جائے تو یہ قرآنی ایمان نہیں، کفر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۴/۱۷۰)

اے نوع انسانی! یقیناً تمہارے طرف اللہ کا رسول حق کے ساتھ آگیا ہے سو اگر تم ایمان لے آؤ تو تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم کفر کرو تو (تمہارے کفر سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑے گا) جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب اللہ کے لیے ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

پھر ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ ایک شخص مانتا ہے کہ نبی اکرمؐ ایک راستباز اور حق گو انسان تھے۔ وہ خدا کی طرف سے سچے رسول تھے لیکن اطاعت انہی امور کی کرتا ہے جو اس کے اسلاف سے اس کے پاس چلے آتے ہیں اور جن کی نسبت کسی سابقہ رسول کی طرف کی جاتی ہے تو سوچیئے کہ اس کے اس زبانی اقرار ایمان سے مفہوم کیا ہے؟ یعنی وہ مانتا ہے کہ خدا کی طرف سے حضورؐ پر قرآن کریم نازل ہوا اور اس قرآن میں یہ لکھا ہے کہ ہدایت و سعادت قرآن کے اتباع ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، لیکن وہ اتباع و اطاعت کے لیے اور گوشے تلاش کرتا ہے، تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ وہ حضورؐ کو اللہ کا آخری رسول اور قرآن کو

برہمو سماجی مسلک

خدا کی کتاب نہیں مانتا۔ اگر وہ ایسا مانتا تو اس کی اطاعت کیوں نہ کرتا؟ جو لوگ اس قسم کی "رواداری" اور "وسعتِ نظر" کی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو خود فریبی میں مبتلا ہیں یا فریب دہی میں۔ اور جو مسلمان انہیں یہ یقین دلاتا ہے کہ ازروئے قرآن اس بات کا بھی امکان ہے کہ رسول اللہؐ کو خدا کا سچا رسول مانتے ہوئے پیروی کسی اور مذہب کی کی جائے، تو وہ ان کے اس فریب پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ خود ہندوستان میں برہمو سماجیوں کا فرقہ موجود ہے جن کے عقائد یہ ہیں۔

(۱) خدائے واحد کی اور صرف اس کی پرستش کی جائے۔ خدا کا کوئی اوتار نہ مانا جائے۔ بت پرستی کی مخالفت کی جائے۔

(۲) صحیفۂ فطرت کو مذہبی اعتقادات کا بنیادی اصول مانا جائے۔

(۳) اگرچہ اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد کسی خاص کتاب پر نہ رکھی جائے لیکن ہر الہامی کتاب کی صداقت و حقانیت کو تسلیم کیا جائے۔

(۴) ہر مذہب کے سچے اصولوں کو اعتقادی اصول مانا جائے۔

(۵) ظواہر و رسوم پر اعتقاد نہ رکھا جائے بلکہ مقصد اصلی قلبی صفائی کو قرار دیا جائے۔

(ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنس اینڈ ایتھکس)

"رواداری" اور "وسعتِ نظر" کے تمام گوشے اس تعلیم کے اندر سمٹے ہوئے ہیں، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس کے باوجود برہمو سماجی حضرات ہندو کے ہندو ہیں۔ ہمیں ان حضرات کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک کسی الہامی کتاب کی "حقانیت اور صداقت" کے اقرار کے معنی فقط اتنے ہی ہیں کہ زبان سے اقرار کر لیا جائے کہ وہ سچی کتاب ہے۔ ان کے اس ایمان میں اطاعت شامل نہیں ہے۔ قرآنی نقطۂ خیال سے یہ حضرات ایک کھلی ہوئی غلطی پر ہیں مگر چونکہ ان کے سامنے قرآن کریم نہیں، اس لیے ان کا یہ عقیدہ چنداں درخورِ اعتناء نہیں۔ لیکن جو شخص قرآن کریم اپنے سامنے رکھنے کا مدعی ہو، اگر وہ بھی اس عقیدہ کا ہم نوا ہو جائے تو اس کے متعلق کیا کہا جائے؟ وہ ان جو کھلے کھلے الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۨ الَّذِيْ لَهٗ

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (۷/۱۵۸)

(اے رسول! ان سے کہہ دو کہ) اے نوعِ انسانی! میں تم تمام کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی مارتا اور وہی جِلاتا ہے پس ایمان لاؤ تم اللہ پر اور اس کے رسول نبی اُمّی پر۔ جو خود اللہ پر اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہے اور اس کا اِتّباع کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

لہٰذا کوئی شخص رسولِ اکرمؐ کو خدا کا سچّا رسول اور قرآن کریم کو سچّی کتاب ماننے کے دعویٰ میں سچّا نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ قرآن کا اِتّباع نہ کرے۔ اور یہ خطاب تمام نوعِ انسانی سے ہے، کسی خاص فرقہ یا گروہ سے نہیں۔

اب شِق سوم کی طرف آیئے۔ یعنی کیا اتّباع میں احکام کتاب کا اِتّباع بھی ضروری ہے یا محض اپنے اپنے انداز پر "خدا پرستی اور نیک عملی" ہی نجات و سعادت کے لیے کافی ہے۔ اس میں جناب آزاد کے نظریہ پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈال لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں۔

(د) اس نے بتایا کہ ایک چیز دین ہے ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لیے اختیار کیے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جاتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(ھ) اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں ..... ترجمان القرآن (صـ ۱۶۳/۱۷)

اقتباسات کے ساتھ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۲ کا حسب ذیل تشریحی نوٹ بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔

(۵) دینِ حق کی اس اصلِ عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ یہ نہیں ہے کہ عبادت کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات اختیار کر لی جائے بلکہ وہ سچی خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔

(صفحہ ۲۲۹ تفصیل اصل کتاب میں دیکھئے)

یہی اقتباسات پنڈت سندر لال جی نے اپنے خطبۂ صدارت میں پیش کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ چونکہ خدا پرستی اور نیک عملی کی تلقین تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے، اور یہی اصل دین ہے، اس لیے ایک ہندو جو اپنے طور طریقے پر اپنے مذہب کی شریعت کا پابند ہے اسی طرح نجات و سعادت کا مستحق ہے جیسے ایک مسلمان قرآنی شریعت کے اتباع سے نجات کا مستحق۔

قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ قرآن کی رُو سے شرع و منہاج کو کتنی اہمیت حاصل ہے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جناب آزاد نے اپنے اس نظریہ کی رُو سے اسلام کی جڑ پر ایسی ضرب کاری لگائی ہے کہ اس نظریہ کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ شجرِ مقدّس پورے کا پورا اکھڑ کر باہر آجاتا ہے۔ قرآن کی رُو سے نبی اکرمؐ سے پہلے جتنے انبیائے کرام تشریف لائے وہ ایک نہ ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوئے۔ اور ایک خاص وقت کے لیے ان کا پیغام نافذ العمل رہتا۔ یعنی ان کی رسالت کا دائرہ زمان و مکان کی حدود سے گھرا ہوا تھا، اس لیے ان کی وساطت سے جو احکامات نافذ ہوتے وہ اس خاص قوم کے حالات کے پیشِ نظر دیئے جاتے جن کی طرف وہ مبعوث ہوتے۔ نبی اکرمؐ کی تشریف آوری سے یہ نظام بالکل بدل گیا۔ حضورؐ کی بعثت کسی خاص قوم، ملک قبیلہ، گروہ یا کسی خاص وقت کے لیے نہیں۔ بلکہ آپ کا پیغام عالم گیر اور آپ کی مخاطب تمام نوعِ انسانی ہے۔ سارا قرآن اس حقیقتِ کبریٰ پر شاہد ہے۔ حضورؐ کی رسالت کا دائرہ زمان اور مکان کے حدود سے محصور نہیں، بلکہ دنیا کے ہر ملک میں ہر زمانہ میں، قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے لیے حضورؐ کی رسالت یکساں ہے۔ اس لیے جو تشریعی احکام قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ وہ کسی خاص قوم کے حالات خاص کر سامنے رکھ کر وضع نہیں کیے گئے، بلکہ وہ عالم گیر ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآنِ کریم کے تشریعی احکام صرف نبی اکرمؐ کے زمانے کے اہلِ عرب کے حالات و مقتضیات کے مطابق نافذ ہوئے تھے تو اسلام کی عالم گیریت کا دعویٰ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اسلام کے احکامات نہ ہر زمانہ میں نافذ العمل ہو سکتے ہیں نہ ہر قوم پر ان

قرآن عالمگیر ہے

کی پابندی لازم قرار دی جا سکتی ہے۔ اس لیے قرآن کریم کے تشریعی احکام کے متعلق یہ کہنا کہ چونکہ ہر عہد اور قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لیے اختیار کیے جائیں، اسلام کے دعوائے آفاقیت (عالم گیریت) کی کھلی ہوئی تردید ہے۔ اسلام نوعِ انسانی کا دین ہے، اور اس کے احکام و اعمال کسی خاص قوم اور خاص عہد کی حالت کو سامنے رکھ کر اختیار نہیں کیے گئے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ مذہب کے ظواہر و رسوم کو میکانکی طریق سے ادا کر لینے کا نام اتباعِ احکام نہیں۔ یہ ظواہر و رسوم جسم کی مثل ہیں جس میں روح کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کے احکام صرف حضورؐ کے زمانہ کے حالاتِ زندگی کے پیشِ نظر اختیار کیے گئے تھے اور آج انہیں کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ اور نجات و سعادت میں انہیں کوئی دخل نہیں۔ کوئی جاہل ہوتا تو اسے ہم سمجھاتے بھی! ہم حیران ہیں کہ جناب آزاد جیسے سمجھدار انسان کو کیسے سمجھائیں کہ اسلام ایک نظام کا نام ہے، اور نظام کا جزو، کل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ احکام قرآنی اس نظامِ اسلامی کے لاینفک اجزاء ہیں اور دنیا کے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکے۔ یا اسلام کے دعوے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جائز قرار دے کہ "نجات و سعادت" ان اعمال و احکام کے علاوہ اور طرح سے بھی حاصل ہو سکتی ہے "نجات و سعادت" اسلامی نظام کا فطری نظریہ ہے۔ اس نظام کے جزئیات کو بدل دیجئے، یہ نتیجہ خود بخود بدل جائے گا۔ جب قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام کے سوا کوئی اور دین قابلِ قبول نہیں تو اس سے مقصود اسلامی نظام ہے نہ کہ "خدا پرستی اور نیک عملی" کے مبہم اور غیر متعین الفاظ۔ قرآن کریم کھولئے اور دیکھئے کہ اس میں ان احکام کی "پابندیوں" کو کتنی اہمیت دی گئی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اہلِ کتاب خدا کو بھی مانتے تھے۔ اور اپنے خیال کے مطابق نیک اعمال بھی کرتے تھے۔ بایں ہمہ

اتباعِ وحی مسلمانوں کو (خاص حالات کے ماتحت) جس طرح کفار اور مشرکین سے قتال کا حکم دیا گیا۔ اس حکم کے وقت اہلِ کتاب کے خلاف جو فردِ جرم (چارج شیٹ) عائد کی گئی ہے۔ اسے ملاحظہ

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُونَ ۝ (۹/۲۹)

اہلِ کتاب جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا اور رسول نے حرام بتایا ہے اور نہ سچے دین کو ہی قبول کرتے ہیں ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر جزیہ دینا قبول کر لیں۔

اس آیۂ جلیلہ سے حسب ذیل امور کی تصریح ہوگی۔

(۱) اہلِ کتاب ہر چند خدا اور آخرت پر ایمان کے مدعی تھے دار ہیں، لیکن قرآن کریم ان کے اس ایمان کو ایمان ہی قرار نہیں دیتا۔ اس لئے کہ، جیسا کہ شقِ اوّل میں بتایا جا چکا ہے، قرآن کریم کی رُو سے ایمان وہی ایمان ہے جو اس طریق پر لایا جائے جو قرآن نے بتایا ہے۔

(۲) اہلِ کتاب کا اس طرح پر ایمان لانے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حرام اور حلال میں ان پابندیوں کو ملحوظ نہیں رکھتے جو قرآن کریم نے عاید کی ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ اسلام صرف "خدا پرستی اور نیک عملی" و بزعم خویش، کا نام نہیں۔ بلکہ قرآنِ کریم کے تشریعی احکام کی پابندی بھی ضروری ہے۔

(۳) تیسرے ٹکڑے میں اس امر کی وضاحت بیان فرما دی کہ ان لوگوں کا اپنے اپنے طریقہ پر خدا پرست بن جانا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ان کے لیے دِینَ الحَقّ قبول کرنا نہایت ضروری ہے۔ یعنی اسلام میں داخل ہونا لازمی شرط ہے۔ دِینَ الحَقّ اس مذہب کا نام ہے جو نبی اکرمؐ کی وساطت سے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اسی دین کے لیے استعمال ہوئے ہیں (ملاحظہ ہو ۹/۳۳ ۴۸/۲۸ ۶۱/۹) مندرجہ صدر آیات کا مطلب بالکل واضح ہے۔ لیکن چونکہ یہ حقیقت جناب آزاد کے نظریہ کے خلاف جاتی تھی اس لیے انہوں نے اپنے ترجمہ میں ایسا اضافہ فرمایا ہے جس سے اس کا مفہوم یکسر بدل جاتا ہے وہ اس آیت کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں۔

اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ نہ تو خدا پر (سچا) ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت کے دن پر نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرا دیا ہے اور نہ ہی سچے دین پر عمل پیرا ہیں ..... (ترجمان القرآن صفحہ ۸۲)

ذرا غور فرمائیے۔ ترجمہ میں چار لفظوں کے اضافے نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی؟ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ "یہ لوگ ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جنہیں اللہ اور رسول نے حرام ٹھہرایا ہے" یعنی قرآن کریم میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے یہ لوگ انہیں حرام نہیں سمجھتے۔ لیکن جناب آزاد نے یہ کہہ کر کہ "جنہیں اللہ اور اس کے

رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرادیا ہے" یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن صرف یہ چاہتا ہے
لوگ ان چیزوں کو حرام سمجھیں جو ان کی کتاب میں حرام ٹھہرائی گئی ہیں۔ اندازہ فرمائیے۔ قرآن کریم پر یہ کتنا
اضافہ ہے اور اس اضافہ کی کتنی بڑی جرأت! یہ ہے تفسیر کا وہ طریقہ جس سے یہ حضرات اپنے نظریوں کو
ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور نہیں ڈرتے کہ یہ جرأت کس قدر بے باک ہے۔

گذشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) قرآن کریم کی رُو سے اجزائے ایمانیہ پانچ ہیں۔ قرآن میں کسی جگہ، خواہ ان میں سے ایک کا انکار
یا ایک سے زیادہ کا مقصود اس سے پانچوں اجزاء ہیں۔ ان میں سے ایک کا انکار بھی کفر ہے۔

(۲) ان پانچ اجزائے ایمانیہ میں نبی اکرمؐ کی رسالت اور قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان
جزوِ لاینفک ہے۔

(۳) ایمان سے مفہوم صرف اقرار کر لینا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اطاعت بھی ہے۔

(۴) ہر رسول اور ہر کتاب کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی اور نبی اکرمؐ کی بعثت کے بعد
خدا کی آخری کتاب قرآن کریم کی ہوگی نہ کہ پہلی کتابوں کی۔

(۵) قرآن کے تشریعی احکام نظامِ اسلامی کا ضروری جزو ہیں اور ان کی اطاعت لازمی ہے۔

ان تصریحات کو سامنے رکھنے کے بعد اب اس آیت کا مطلب سمجھئے جو اس باب میں اس جدید
(یکسانیتِ مذاہب) کے مؤیدین کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۶۲)

تحقیق جو لوگ ایمان والے ہیں اور یہود و نصاریٰ اور صابئین اور جو شخص بھی اللہ اور آخرت پر
لائے اور عمل اچھے کرے ان کا اجر انکے اللہ کے پاس ہے۔ اور انکو کسی قسم کا خوف و حزن نہیں۔

ایک اہم آیت

اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور صابئین
ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا مطالبہ ہے۔ قرآن پر ایمان لانے کا

جو کچھ ہم اس وقت تک لکھ چکے ہیں اس کے پیشِ نظر اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے میں دقت نہیں ہو گی۔ پہلی چیز تو یہ کہ ایمان سے صرف اللہ اور آخرت پر ایمان مقصود نہیں، بلکہ اس کے اندر پانچوں اجزائے ایمان شامل ہیں۔ قرآن شریف میں جہاں بھی ایمان کا تقاضا ہے مکمل ایمان کا ہے اور اس مکمل ایمان کے متعلق تصریحاً ارشاد موجود ہے کہ۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا

اگر یہ لوگ ایسا ایمان لائیں جیسا تم لائے ہو پھر یہ ہدایت پر سمجھے جائیں گے۔

دوسرے یہ کہ اگر اس سے صرف اللہ اور آخرت پر ایمان ہی کا مطالبہ ہو تو آیت میں یہود و نصاریٰ کے علاوہ خود مسلمانوں کا بھی ذکر ہے۔ تو کیا مسلمانوں سے بھی یہی مطالبہ ہے کہ وہ فقط اللہ اور آخرت پر ایمان رکھیں؟ اگر ان سے بھی یہی مطالبہ ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن پر ایمان کا مطالبہ کن سے ہو گا۔

آیت کا مطلب واضح ہے۔ اسلام سے پہلے لوگوں نے مذہب کو (نسلوں اور قوموں) کے اندر مقید کر رکھا تھا۔ توریت، قوم بنی اسرائیل (یہود) کے لیے۔ مذہب عیسوی بھی انہی کے لیے، کیونکہ انجیل میں یہ قول حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے آیا ہوں۔ بیٹوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہندوؤں کے ہاں انسانوں کی تقسیم ہی پیدائشی درنوں کی رُو سے ہوتی ہے، اور درنوں کی یہ کیفیت ہے کہ نہ نچلے درن کا ہندو اوپر کے درن میں جا سکتا ہے اور نہ ہی خدا کے حریمِ قدس میں اس کے لیے باریابی کی کوئی راہ کھلی ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی مذہبی عقائد میں داخل ہو چکا تھا کہ ایک شخص محض یہودی کے ہاں پیدا ہو جانے سے ابناء اللہ (خدا کی اولاد میں) داخل ہو کر نجات کا مستحق ہو جاتا ہے۔ عیسائی کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کی نجات کے ذمہ دار حضرت مسیح علیہ السلام بن جاتے ہیں۔ یعنی مذاہب عالم میں یہ عقیدہ موجود تھا کہ:۔

(۱) نجات و سعادت محض ایک خاص فرقہ کے گھر میں پیدا ہو جانے سے مل جاتی ہے۔ اور

(۲) اس فرقہ کے باہر کا انسان چونکہ اس فرقہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ (کیونکہ فرقہ میں داخلہ تو صرف پیدائش کی رُو سے ہوتا ہے) اس لیے اس پر نجات کے سب دروازے بند ہیں (واضح رہے کہ ہندوؤں اور یہودیوں میں تبلیغ کا تصور ہی نہیں اور عیسائیوں کے ہاں بھی تبلیغ بعد کی چیز ہے)

قرآن نے آکر ان نظریات کی تردید کی اور اعلان کر دیا کہ نجات کو پیدائش سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی کسی کے

ا ہو۔ (یہودی، نصرانی، صابی وغیرہ) وہ ایمان لانے سے اسلام کے دائرہ میں کھلے بندوں داخل
ہے۔ اور اعمال صالحہ کرنے سے جنت کا اہل بن جاتا ہے۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُوْنَ ۝ (۲/۶۲) باقی رہے مسلمان سو انہیں بھی اس زعم باطل میں نہیں رہنا چاہئے کہ وہ
اس لیے کہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں نجات کے حقدار بن جائیں گے۔ انہیں بھی اپنے آپ
کو ایمان ثابت کر کے اعمال صالحہ کے ذریعہ جنت کا مستحق بنانا ہوگا۔ خود مسلمانوں سے ایمان کا
مطالبہ صرف اسی ایک مقام پر نہیں، بلکہ اور آیات میں بھی ہے۔ مثلاً سورۂ نساء میں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ
نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (۴/۱۳۶)

اے مسلمانو! (ایمان والو!) ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اس کے
رسول پر نازل کی گئی اور ان کتابوں پر جو اس سے پیشتر نازل کی گئیں۔

سورۂ توبہ میں ایمان کی اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا ایمان
محض زبان تک تھا۔ نہ دل کی گہرائیوں میں اس کا سرچشمہ تھا۔ اور نہ اعمالِ حیات اس کے مصدق۔ (انہیں
منافق کہا گیا ہے)۔ زندگی کے باقی شعبوں میں تو خیر پھر بھی یہ نقاب پوشانہ روش کسی نہ کسی طرح نبھ جاتی
تھی لیکن میدانِ جہاد، ایمان کی بہت بڑی کسوٹی تھی۔ اس موقع پر یہ لوگ ادھر اُدھر کی بہانہ تراشیوں سے
بچ کر نکل جانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ "اصطلاحی" مسلمان تھے۔ ان کا ایمان کا اقرار
لسانی ہی زبانی تھا۔ ان کے مقابلے میں وہ پکے مسلمان تھے جو مشکل سے مشکل مقام پر اپنے ایمان کا زندہ ثبوت
پیش کرتے تھے۔ ان ہر دو فریق کے متعلق فرمایا۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ
فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۝ (۹/۴۴-۴۵)

جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے مال و جان سے جہاد کرنے کے بارے میں

تم سے اجازت نہ مانگیں گے اور اللہ متقیوں کو جانتا ہے (جہاد میں نہ جانے کے لیے) صرف وہی لوگ تم سے اجازت مانگیں گے جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ سو وہ اپنے شک میں حیران و متردد ہیں۔

اس آیتِ مقدسہ سے دو تین باتیں واضح طور سے سامنے آگئیں۔

(۱) ظاہر ہے کہ وہ اہلِ ایمان (سچے مسلمان) جو جہاد میں مال و جان سے شریک ہوتے تھے اللہ اور آخر کے علاوہ ملائکہ، کتب اور رسل پر بھی ایمان رکھتے تھے لیکن یہاں صرف ان کے ایمان باللہ اور ایمان بالآ ہی کا ذکر کافی سمجھا گیا ہے۔

(۲) منافقین وہ لوگ تھے جو زبان سے تمام اجزائے ایمانیہ کا اقرار کرتے تھے مسلمان کہلاتے تھے۔ انہی میں رہتے سہتے تھے۔ لیکن قرآن ان کے ایمان کو ایمان نہیں تسلیم کرتا اور واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

(۳) لہٰذا جب مسلمانوں سے کہا جائے گا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لاؤ اور نیک اعمال کرو تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ تمہارا پیدائشی مسلمان ہونا یا محض زبان سے ایمان کا اقرار کر لینا کافی نہیں۔ ایمان دل سے ہونا چاہیئے اور اعمالِ زندگی سے اس کی تصدیق ہونی چاہیئے۔ یہ ہیں سچے مومن۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَ أَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝ (۴۹/۱۵)

مومن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور پھر (اس ایمان میں) انہیں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جان سے جہاد کریں یہ لوگ ہیں سچے (مسلمان)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ..... ایک مسلمان کے لیے "نجات و سعادت" حاصل کرنے کے لیے ایسی کڑ شرطیں ہیں کہ وہ اس انداز کا ایمان لائے جیسا قرآن کریم نے متعین کیا ہے۔ پھر زندگی کے ہر ہر قدم پر اسی بارگ سے فیصلہ طلب کرے اور ان فیصلوں کو بطیبِ خاطر منظور کرتا جائے۔ حرام اور حلال کی پابندیاں اپنے او عائد کرے اور ان سب کے بعد مال اور جان جیسی عزیز ترین متاع کو ہر وقت ہتھیلی پر رکھ۔ اللہ کی راہ

جان کرنے پر آمادہ ہو۔ یعنی اپنے آپ کو ہر وقت شہادت گاہ میں تصور کرے۔ تب جاکر کہیں نجات کی امید
متوقع ہو۔ اس کے برعکس ایک غیر مسلم (مثلاً ہندو) کے لیے فقط اتنا ضروری ہے کہ صبح اٹھ کر اپنے ہاں
کے رواجی طریقہ کے مطابق "خدا کی بھگتی" کرے اور کبھی کبھار "دان" (خیرات) کر دے۔ مثلاً چڑیوں کو دانہ
دیا۔ سانڈ کے لیے چارہ خرید دیا۔ کیڑوں مکوڑوں کے استھانوں پر آٹا ڈال دیا۔ اس سے آگے بڑھے تو کوئی
پیاؤ بنوا دیا۔ اور استطاعت ہوئی تو کنواں کھدوا دیا۔ سرائے یا ہسپتال بنوا دیا۔ دان (خیرات) کی کچھ اقسام
ات ہیں۔ اس کے بعد اپنے اوپر نہ کوئی خاص پابندی عائد کرنے کی ضرورت، نہ اسلامی احکام کی کٹھن
طے کرنے کی حاجت۔ نہ ہجرت کی صعوبات اٹھانا ضروری، نہ خدا کی راہ میں سر کٹوا دینے کا سوال (بلکہ
جہاد کا تصور ہی گناہ ہے کہ یہ چیز اہمسا میں داخل ہے)۔ یہی نہیں بلکہ جہاں ایک مسلمان کے لئے ضروری
کہ وہ صرف اس نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے جو خدا کا متعین فرمودہ ہے، اس غیر مسلم کو کھلی اجازت
کہ وہ جونسا نظام اپنے لئے چاہے وضع کر لے اور جس نظام کے ماتحت چاہے زندگی بسر کرے۔ وہاں انسانی
نظام اور خدائی نظام کا سوال ہی کچھ نہیں۔ اسے بس اتنا ہی کچھ کرنے کی ضرورت ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا
ہے۔ اس سے وہ نجات کا مستحق قرار پا جائے گا۔ اب سوچئے کہ جب انسانی زندگی کی تمام تگ و دو کا مقصد
ٹھہرا حصولِ نجات، اور یہ مقصد ایک طرف اس قدر جاں گسل اور صبر آزما مراحل طے کرنے کے بعد حاصل
اور دوسری طرف اتنی آسانی سے، تو وہ کون سا "صحیح العقل" انسان ہوگا جو اس قدر آسان طریقہ کو چھوڑ
کٹھن طریقِ زندگی اختیار کرے جس میں ایک ایک سانس پر قیامت کا سامنا ہو۔ اگر نجات اسی طرح
حاصل ہو جاتی تھی تو پھر قرآن کریم میں اس قدر تفصیلی ہدایات اور احکامات کی کیا ضرورت تھی؟ اس میں
یہ لکھ دینا کافی تھا کہ لوگو! خدا کی ہستی کو مانو اور اپنے اپنے طور طریقہ پر نیکی کے کام کرتے رہو، تمہاری
نجات یقینی ہے۔ اگر "رواداری اور وسعتِ نظر" کی ایسی "صلح کل" روش اختیار کر لی جاتی تو نہ کہیں
آواز اٹھتی، اور نہ کوئی برسرِ پیکار رہتا۔ نہ حضورؐ اور آپ کے متبعین کو اس قدر تکالیف کا سامنا
چھوڑنا پڑتا، نہ مدنی زندگی میں اس قدر غزوات و سرایا کی ضرورت پڑتی۔ ساری دنیا خوش ہو جاتی
نجات کا طریقہ بھی نہایت آسان مل جاتا۔ اور پھر اس کے بعد آج تک جو چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ
سلسل ستیزہ کاری چلی آتی ہے، اس کا بھی کہیں وجود نہ ہوتا۔ ساری دنیا (سوائے چند
ہستی سے مشکل ... بعد کفر و اسلام اور حق و باطل کا کوئی جھگڑا ہی پیدا نہ ہوتا

خدا پرستی اور نیک عملی

"خدا پرستی اور نیک عملی" کے مبہم الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجئے۔ سوال یہ ہے کہ خدا پرستی کسے کہتے ہیں اور نیک عملی کیا ہے؟ کیا یہی کہ جس انداز پر کسی کا جی چاہے خدا کی پوجا و پرستش کرے اور جس کام کو وہ نیک سمجھتا ہے۔ اسے اختیار، اور جسے بُرا قرار دیتا ہے اس سے اجتناب کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض الفاظ (یا مذہبی اصطلاحات) مسلمانوں میں رائج ہو چکے ہیں لیکن وہ اس اسلامی مفہوم کو قطعاً ادا نہیں کرتے جس کے لیے وہ شروع میں اختیار کئے گئے تھے۔ یہی نہیں کہ وہ الفاظ اسلامی تعلیم کے صحیح ترجمان نہیں بلکہ بعض اوقات ان سے ایک ایسا مفہوم مترشح ہوتا ہے جو روحِ اسلام کے یکسر منافی ہوتا ہے۔ انہی الفاظ میں "پرستش" کا لفظ بھی داخل ہے۔ دیگر ادیان میں خدا اور بندے کا تعلق پرستش اور پوجا (WORSHIP) کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے لیکن اسلام میں اس کے لیے "عبودیت" کا لفظ ہے جو پرستش سے الگ معنی رکھتا ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کر دینے سے وہ تمام غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو یکسانیتِ مذاہب تک منتج ہوتی ہیں۔

اپنے سے کسی بڑی ہستی کا تصور، انسان کے اندر ابتدا سے چلا آتا ہے۔ جب انسانیت اپنے عہدِ طفولیت میں تھی تو انسانوں کی زندگی انفرادی تھی۔ جنگلوں اور غاروں میں رہائش، پھل اور شکار ذرائع معاش۔ کسی ایک انسان کو دوسرے سے واسطہ نہیں۔ اس زندگی میں "خدا" کے ساتھ اتنا ہی تعلق سمجھا جاتا تھا کہ مصیبت کے وقت اس کے سامنے گڑگڑا لیا اور خوشی کے وقت اس کے حضور ناچنے کودنے سے جشنِ شادمانی منعقد کر دیا۔ خدا، دیوی، دیوتا۔ ان کے نمائندے تھے یا بتوں کی شکل میں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ ان دیوتاؤں کو خوش رکھیں۔ اس کوشش کے مظاہر کا نام پرستش یا پوجا پاٹ تھا۔ اس دوران میں جب کبھی وحی آسمانی کی روشنی آ گئی۔ اس نے انسانی تصورات کے ان غلط پردوں کو اٹھا کر خدا کا تصور پیش کر دیا۔ جب وہ روشنی گم ہو گئی تو پھر وہی تاریکی چھا گئی۔ رفتہ رفتہ انسانیت نے کچھ اور ارتقائی منازل طے کئے اور انسانوں نے مل جُل کر رہنے کی طرح ڈالی۔ اب انفرادیت سے قبائل کی طرف رجحان ہوا۔ انسانوں کا ایک دوسرے سے تعاون و تناصر کا تعلق قائم ہوا۔ اشتراکِ عمل کی صورتیں جلوہ پیرا ہوئیں۔ اس سے باہمی حقوق اور ان کی نگہداشت کا سوال پیدا ہوا۔ اور ان کے صحیح تعین کے لئے خدا کی طرف سے احکام بھی آنے شروع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر انسانی مقتضیات ہوتے تھے اسی اندازہ سے احکام ملتے تھے۔ زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ ان مقتضیات میں ترقی اور تبدیلی ہوتی گئی اور ان کے ساتھ ساتھ سلسلۂ احکاماتِ الٰہیہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ ان احکام کی رُو سے

انسان اور خدا کے درمیان تابع اور متبوع، حاکم اور محکوم کا تعلق قائم ہوا۔ چونکہ آسمانی ہدایت زیادہ عرصہ تک انسانوں کے پاس محفوظ شکل میں نہیں رہتی تھی اس لیے احکامات کی روح مسخ ہو جاتی خدا کے متعلق حاکم اور فرمانروا کا تصور بھی گم ہو جاتا اور پھر وہی پرستش کا ابتدائی تصور غالب آجاتا۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تاآنکہ انسانوں نے انفرادیت کی جگہ اجتماعیت کی زندگی اختیار کر لی اور اس کے بعد ان کی تمام جدوجہد کا منتہیٰ اجتماعیت کی تشکیل قرار پا گیا۔ اب وقت تھا کہ انہیں ایک ضابطۂ حیات دے دیا جاتا جس میں نظام اجتماعیت کی مکمل ترین صورتوں کے لیے آئین و قوانین موجود ہوں۔ اس ضابطہ نے یہ بتایا کہ نظام اجتماعیت کے لیے جس قدر آئین و ضوابط ذہن انسانی کی پیداوار ہوں گے وہ انسانیت کی نشوونما ارتقاء کے راستہ میں حائل ہوں گے۔ انسانیت کی نشوونما صرف اس ضابطۂ حیات کی رُو سے ہو سکتی ہے جو تشکیل انسانیت کے لیے خدا کی طرف سے عطا کیا گیا ہے اور جسے قرآن کریم کہتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ اب خدا پر ایمان رکھنے والے ہر انسان کا فریضہ ہے کہ کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعت کے وضع کردہ نظامہائے زندگی کی جگہ اس نظام کے نفاذ کے لیے جدوجہد کرے جو خدا کی طرف عطا ہوا ہے۔ یعنی دنیا میں انسانوں کی جگہ خدا کی بادشاہت قائم ہو، اور اس طرح انسان اللہ کے سوا کسی اور کا عبد نہ بنے۔ یہ ہے خدا اور بندے کے درمیان صحیح تعلق۔ یعنی عبد اور معبود، محکوم اور حاکم کا تعلق۔ عبودیت سے مراد یہ ہے کہ اپنی تمام قوتوں کو نظام خداوندی کے تقاضوں کے مطابق صرف کیا جائے اب آپ نے دیکھ لیا کہ پرستش کا لفظ خدا اور بندے کے تعلق کے قرآنی مفہوم کو بالکل ادا نہیں کرتا۔ یہی نہیں کہ صرف ادا ہی نہیں کرتا بلکہ ایک الگ مفہوم پیدا کر دیتا ہے۔ وہ مفہوم جو انسانیت کے عہد طفولیت کا پیدا کردہ اور اسکی انفرادی زندگی کے دور کی یادگار ہے۔ اس معنی میں "خدا پرستی" تو ہر مذہب میں ایک جیسی ہو سکتی ہے لیکن خدا کی عبودیت صرف اسلام میں داخل ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے اس لیے جس ضابطہ خداوندی کی رُو سے خدا کی محکومیت اختیار کی جا سکتی ہے وہ آج قرآن کریم کے باہر اور کہیں نہیں۔ اسلام کا مطالبہ نظام خداوندی قائم کرنے کا ہے۔ خدا پرستی (یعنی خدا کی پوجا یا پرستش) کا نہیں۔ لہٰذا ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں خدا کے علاوہ کسی اور کی محکومیت کو جائز نہیں سمجھتا۔ باقی چاروں اجزائے ایمان اسی اصل کی شاخیں ہیں یعنی:۔

ایمان کا صحیح مفہوم

(۱) خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا اقرار۔ } اللہ پر ایمان

(۲) یہ محکومیت اس ضابطہ کی رُو سے اختیار کی جائے گی جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اور جس کی آخری شکل قرآن کریم ہے۔	کتابوں پر ایمان
(۳، ۴) یہ ضوابط ملائکہ کے ذریعہ حضرات انبیائے کرام پر نازل ہوتے رہے۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔	ملائکہ اور رسولوں پر ایمان
(۵) اس طرزِ زندگی کا فطری نتیجہ دنیا کی سرفرازی اور آخرت کی سربلندی ہے اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔	آخرت پر ایمان

یہ ہے قرآنی ایمان سے مفہوم۔ ان اجزائے ایمانیہ میں سے سب کا ذکر ہو یا کسی ایک جزو کا، مقصد پورے کے پورے نظام سے ہے۔

اب رہی "نیک عملی" سو روحِ اسلام سے واقف ہو جانے کے بعد اس کی تعریف بھی کچھ مشکل نہیں، تی ہر وہ قدم جو دنیا میں نظامِ خداوندی قائم کرنے کے لیے اٹھے نیک ہے، اور جو اس کے خلاف ہو بُرا ہے۔ ا[نسان] اپنے ابتدائی عہد میں جس طرح ایمان باللہ سے مفہوم صرف خدا کی پرستش (پوجا) لیتا تھا اسی طرح اس کا نیکی کا تصور بھی بہت ابتدائی تھا۔ اس زمانے میں زندگی انفرادی تھی، اس لیے نیکی اور بدی بھی انفرادی اعمال کا نام تھا۔ مثلاً اگر وہ دیکھتا کہ ان میں ایک انسان بیماروں سے ہمدردی کرتا ہے ضعیفوں کی مدد کرتا ہے، جانوروں پر شفقت کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ تو وہ ایسے انسان کو نیک آدمی خیال کرتے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انفرادی زندگی میں نیکیاں اسی قسم کی ہو سکتی ہیں لیکن اجتماعی زندگی میں نیکی اور بدی کا معیار اس سے کہیں بلند ہو جاتا ہے۔ اس وقت یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کسی قوم کی تہذیب و تمدن کے اساس و مبانی کیا ہیں؛ وہ انسانوں کے لیے کس قسم کا نظامِ زندگی تجویز کرتی ہے؟ دنیا پر اس تہذیب و نظام کے اثرات کیا ہیں! اگر اس کے اثرات انسانیت سوز ہیں تو اس قوم کے افراد کی ذاتی "نیکیاں" (مثل خیرات وغیرہ) انسانیت کی میزان میں نیکیاں نہیں قرار پا سکتیں، جب تک وہ لوگ اس نظام کے ممد و معاون اور دست و بازو رہیں گے ان کا کوئی عمل عملِ صالح نہیں کہلا سکے گا۔ کسی کی رگِ جان پر جونکیں لگا دینا کہ وہ اس کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیں اور جب اس پر ضعف کے دورے پڑنے لگیں تو اس کے حلق میں [illegible]

میں ہی نیکی قرار پا سکتا ہے۔ قرآن کریم، نظامِ عدل کے قیام کی تعلیم دیتا ہے جس کا مفہوم تمام نوعِ افراد کا تحفظ ہے۔ اس نظام کا نام خدا کی بادشاہت ہے۔ ایک شخص بڑا مخیّر ہے۔ اچھے اچھے کاموں میں غریبوں کی امداد کرتا ہے۔ عادات و خصائل نہایت عمدہ ہیں۔ لیکن حکومتِ وقت کو تسلیم نہیں کی جگہ کسی دوسری حکومت کے قیام کی فکر میں ہے۔ تو حکومت کی نگاہوں میں وہ جرم ایسا ہے کہ اس کی "ذاتی نیکیاں" اس کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ اور اگر اس کے خلاف جائے تو اسے سخت ترین سزا دی جائے گی۔

خدا کی بادشاہت کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا نام ایمان ہے اور اس کے خلاف خود ہی اندازہ فرما لیجئے کہ کفر میں زندگی بسر کرنے والے کی ذاتی نیکیاں میزانِ تی ہیں؟ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے کہ اُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ (یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال رائیگاں جاتے ہیں) یعنی جن اعمال کو وہ بزعمِ خویش نیک ہیں وہ دراصل نیک ہوتے ہی نہیں۔ اس لیے ان کا نتیجہ بھی کچھ نہیں نکلتا۔ آپ چاک کو کونین سمجھ وشام پھانکتے رہیے، ملیریا کبھی دور نہیں ہو گا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً
...... فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (۲۴/۳۹-۴۰)

جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے اعمال ایک صحرا میں سراب کی طرح ہیں جسے ایک پیاسا پانی سمجھتا ہے اور اس کی طرف جاتا ہے۔ لیکن جب اس کے پاس جاتا ہے تو وہاں کوئی اصلی چیز اسے نظر نہیں آتی البتہ وہاں اللہ نظر آتا ہے جو اسے پورا پورا حساب دیتا ہے۔ کیونکہ وہ بہت سریع الحساب ہے۔ یا ان کے اعمال، ایک بحرِ ذخار میں گھٹا ٹوپ اندھیرے کی طرح ہیں جہاں موج اور ان کے اوپر دو سیاہ بادل، تو بہ تو ظلمات (ایسی کہ) جب وہ اپنا ہاتھ باہر نکالے تو دکھائی نہ دے) اور حقیقت یہ ہے کہ جسے اللہ روشنی نہ دے اسے کہیں سے روشنی نہیں مل سکتی۔

لوگ نظامِ حیات کو اعمالِ حیات سے الگ سمجھتے ہیں، حالانکہ اعمال وہی نتیجہ خیز ہیں جو صحیح نظام ں۔ نظام سے الگ ہٹ کر انفرادی اعمال کچھ وقعت نہیں رکھتے تو بہ کے تیسرے رکوع کو دلنشین انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس وضاحت کرتے ہوئے فرمایا

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۹/۱۹)

کیا تم خیال کرتے ہو کہ حاجیوں کو پانی پلانا (سبیلیں لگوا دینا) یا خانۂ کعبہ کی خدمت (کرنے والا) اس شخص کے برابر ہے جو اللہ۔ اور آخرت (نظامِ خداوندی) پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے راستہ میں جدوجہد کرتا (تمہاری سطح میں نگاہیں کچھ ہی کہیں) اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ ظالمین کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔

قرآن کریم کے متعدد مقامات میں ان امور کی تصریحات موجود ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ قرآنی معیار کے مطابق نیک عملی کسے کہتے ہیں۔

ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر غور فرمائیے کہ یہ نظریہ کہ نجات و سعادت کے لیے کسی خاص نظامِ زندگی کی ضرورت نہیں "خدا پرستی اور نیک عملی" جو اصولی طور پر ہر مذہب میں یکساں موجود ہے نجات کے لیے کافی ہے، کس قدر قرآنی تعلیم کے خلاف ہے؟ واضح رہے کہ یہ دعویٰ کہ اسلام کو باقی ادیان پر افضلیت و فوقیت حاصل ہے کسی مذہب کے خلاف عداوت پیدا کرنے کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اسلام محض اختلافِ مذاہب کی بنا پر عداوت نہیں سکھاتا۔ وہ تو امن و سلامتی کا پیامبر ہے۔ اس کے اس دعویٰ کا اعلان و تبلیغ، نوعِ انسان کی ہمدردی اور بہی خواہی ہے۔ جیسے آپ کسی مریض سے کہیں کہ بھائی تمہارا مرض اِدھر اُدھر کے بے قاعدہ علاج سے نہیں جائے گا۔ اس کے لئے فلاں طبیب کی طرف رجوع کرو۔ وہی ان امراض کا ماہر ہے اور اسی کے ہاں اصلی نسخے مل سکتے ہیں۔ یہ مشورہ مریض سے عداوت نہیں، بلکہ محبت پر مبنی ہے۔ عداوت تو اس کی طرف سے ہو گی جو یہ کہے گا کہ نہیں سب دواخانے ایک ہی جیسے ہیں۔ جہاں سے جی چاہے نسخہ لکھواؤ اور دوائی خرید لو حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جب دوائی خانوں کے اصلی مالک نے اعلان کر دیا کہ اب صحیح نسخے صرف فلاں دواخانے سے مل سکیں گے (باقی دواخانے ہمارے نام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دھوکا دیتے ہیں) تو ہر دواخانے کو ایک جیسا بتانا مالک کے اس اعلان کی تکذیب اور مریض سے کھلی ہوئی دشمنی ہے۔ وَفِيْهَا اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔

اسلام دین ہے

اس مقالہ میں اسلام کے لیے بھی مذہب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اسلام درحقیقت مذہب نہیں، دین ہے۔ اس لیے اسلام کا مذاہب عالم کے ساتھ مقابلہ ہی غلط ہے۔ جب یہ مذہب ہے ہی نہیں تو مذاہب کے ساتھ مقابلہ کیسا؟ یہ دین ہے اور دین کے معنی ہیں نظامِ حیات۔ اس لیے اسلام کا مقابلہ کرنا ہو تو دنیا کے دیگر نظام ہائے حیات کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ ابوالکلام صاحب آزاد اور ان کے اتباع میں اور لوگوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اسلام کو بھی مذہب تصور کرتے ہیں۔ جب اسے ایک مذہب تصور کر لیا جائے تو پھر واقعی اسلام میں اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس صورت میں اسلام کی افضلیت ثابت کرنا بے سود کوشش ہے۔ جب مقصد پوجا پاٹ ٹھہرا تو پوجا مندر میں کر لی تو کیا۔ اور مسجد میں کر لی تو کیا؟ جب مقصود یاترا ہو جائے تو ہردوار چلے گئے تو کیا اور مکے ہو آئے تو کیا؟ جب مطلب دان دخیرات سے ہو تو کسی کو بھیک دے دی تو کیا اور زکوٰۃ دے دی تو کیا۔ اس تصور کے ماتحت فی الواقع خدا پرستی اور نیک عملی سب جگہ ایک جیسی رہ جاتی ہے بلکہ اس کے لیے "خدا پرستی کی شرط بھی بے معنیٰ ہو جاتی ہے۔ ضوابطِ اخلاق (سچ بولو، جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، حرام نہ کھاؤ، زنا نہ کرو) ہر جگہ یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ خدا کے منکر ہیں وہ بھی ان ضوابط کو اچھا کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے خدا پرستی بھی کچھ ضروری نہیں رہتی۔ ان ضوابطِ اخلاق کا نام "سچا دین" قرار پا جاتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں میں ایک مدت سے یہ عقیدہ چلا آتا ہے کہ اسلام بھی ایک مذہب ہے۔ اس لئے ان کے ہاں بھی خدا سے صرف پوجا پاٹ کا تعلق باقی رکھا جاتا ہے، اور نیک عملی ان ضوابطِ اخلاق کا نام رکھ لیا جاتا ہے چند عقائد چند عبادات کی شکلیں، اور وہ اخلاقی احکام جو ہر جگہ عام ملتے ہیں، بس ان کے مجموعہ کا نام ہے اسلام اس اسلام میں اور دیگر مذاہب میں کچھ فرق نہیں۔ ابوالکلام صاحب کے پیشِ نظر بھی اسلام کا یہی تصور تھا اس لیے ان کا نتیجہ مستخرجہ بھی ٹھیک تھا کہ اسلام اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور باقی مولوی صاحبان میں فرق صرف اتنا ہے کہ انہوں نے اس بات کا اعلان کر دیا اور دوسروں نے اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پائی۔ ورنہ عملاً ہر مولوی کا یہی عقیدہ ہے، خواہ وہ زبان سے اس کا اقرار کرے یا نہ کرے، یا یوں کہیئے کہ ان کے عقیدے کا لازمی نتیجہ وہی ہے جس کا اعلان آزاد صاحب نے کر دیا ہے۔

لیکن جب یہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام مذہب نہیں ایک نظامِ حیات ہے، تو پھر اس بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اس اسلام سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جس کا تصور آزاد صاحب پیش کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ

نظامِ حیات ایک خاص ذہنیت کا متقاضی ہوتا ہے۔ جب تک وہ ذہن پیدا نہ ہو اس قسم کا نظام قائم ہو سکتا۔ ایمان اس خاص ذہنیت کو کہتے ہیں جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ قرآن کا تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک ہی نظامِ حیات ہے۔ لہٰذا تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک ہی اندازِ ایمان اسلام کے اس قرآنی تصور کی رُو سے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ نظام ہر قوم اور ہر مذہب میں ایک جیسا یہ نظام قرآن کے علاوہ کہیں نہیں۔ اس لیے تقابل کا سوال ہی سامنے نہیں آتا۔

یہ ہے وہ بنیادی غلطی جس پر ابوالکلام صاحب آزاد کی برہمو سماجی تفسیر کی پوری عمارت اٹھی ہے

تعزیت

۱- بزمِ طلوعِ اسلام جلہ جیم ضلع وہاڑی کے نمائندہ

حکیم قمر الزمان ثقلینی

طویل علالت کے بعد مورخہ ۳۰ر نومبر ۱۹۸۷ء کو ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ مرحوم اپنے علاقہ کے معزز اور با اثر اشخاص میں سے تھے۔ وہ اپنی علم دوستی اور غرباء پروری کے سبب ہر خاص و عام میں مقبول تھے۔

2-

میاں عبد الخالق

جو ایک معروف سماجی کارکن، مینارِ پاکستان لاہور کے معمار اور محترم **پرویز صاحب** کے پرانے دوست تھے، ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو اس دارِ فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ مرحوم بالخصوص لاہور کی کئی سماجی اور سیاسی تنظیموں کے ہر دلعزیز اور سرگرم رکن رہے۔

ادارہ مرحومین کی وفات پر دلی تاسف کا اظہار کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں مقام بلند پر فائز فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو یہ صدمات برداشت کرنے کی ہمت دے .... خدائے مسبب الاسباب سے مزید استدعا ہے کہ مرحومین کی رحلت کے سبب سے تحریک طلوعِ اسلام اور ان کے لواحقین کے لیے جو خلاء پیدا ہوئے ہیں ان کے ازالہ کی صورت پیدا فرمائے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

...یا عندلیب

عمر اور زندگی

عمر اور زندگی کے دو لفظ جو ہمارے ہاں بولے جاتے ہیں۔ بظاہر ان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اور دونوں لفظوں کا ستعمال عام طور پر ایک ہی معنوں میں ہوتا ہے۔ ویسے بھی ہر لفظ پر غور کرنے اور اس کی حقیقت پر توجہ دینے کا ہمارے ہاں رواج نہیں۔ رک کر سوچنا ہمارا شیوہ نہیں۔ ہم تو اکثر و بیشتر الفاظ پڑھتے ہوئے بھی ان کے معنی کی طرف دھیان نہیں دیا کرتے۔ بلکہ ان پر سطحی نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جانا ہمارا روز کا معمول ہے۔ بات چلی ہے عمر اور زندگی کے الفاظ سے۔ تو آیئے ذرا ذہن کو بیدار کرتے ہوئے اور بصارت کے ساتھ بصیرت سے کام لیتے ہوئے یہ دیکھیں اور اس پر غور کریں کہ عمر اور زندگی کس لحاظ سے مترادف المعنی اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ اور دوسری طرف ان میں وہ کون سا فرق ہے جس سے یہ ایک دوسرے سے الگ اور متمیز ہوتے ہیں۔ یہ چیز تو سب کے سامنے ہے کہ عمر ہفتوں مہینوں اور سالوں سے بنائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں نے بہت چھوٹی عمر پائی۔ بیس سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ چل بسا۔ اسی طرح فلاں نے لمبی عمر پائی ۹۰ سال کا ہو کر فوت ہوا۔ گویا عمر کا تعلق سانس لینے سے ہے جب آخری سانس لی تو عمر ختم ہوگئی۔ لیکن انسان کی زندگی کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس کی عمر کے ساتھ شروع تو ہوتی ہے لیکن نہ تو اسے بیس تیس یا ۹۰ سالوں سے ناپا جاتا ہے۔ نہ ہی وہ عمر کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے آگے جانا ہے۔ اور سفر آخرت اختیار کرنا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ آخرت میں تمہاری زندگی پہچانی جائے گی عمر نہیں۔ جہاں تک انکا انحصار ایک دوسرے پر ہے تو اس کا تعلق اس دنیا سے ہے کہ عمر ہوگی تو زندگی ہوگی اور اس لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں مگر عمر مقصود بالذات نہیں بلکہ یہ ذریعہ ہے اعلیٰ قدر زندگی کے حصول کا جو صرف اس دنیا سے ہی متعلق نہیں بلکہ یہ وہ زندگی ہے جسے ارتقاء کے مراحل طے کرنے ہیں۔ آگے بڑھنا ہے اور اس دنیا سے سرخرو ہوتے ہوئے اگلی دنیا میں قدم رکھنا ہے جسے آخرت کہتے ہیں۔ عمر کا تعلق ہمارے مادی جسم سے ہے جو آخری سانس کے ساتھ مردہ اور بیکار ہو جاتا ہے۔ قبر میں دبا دیا جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن عمر کے اس خاتمہ سے زندگی پر کوئی آنچ نہیں آتی اس لئے کہ اس کا تعلق ہماری ذات اور ہماری روح سے ہے۔ جو عمر سے الگ ہو کر اپنی اگلی منزل میں جا پہنچتی ہے۔ ہاں، مگر وہی ذات یا وہی روح انسانی جو نشوونما یافتہ ہوتی ہے۔ جسے دنیاوی عمر اس لئے دی گئی کہ وہ اس عمر کے ہر سانس کو اپنی زندگی سنوارنے یعنی اپنی ذات کی نشوونما دینے میں صرف کرے

زندگی حرکت، حرارت اور عمل کا نام ہے، محض سانس لینے کا نہیں۔ زندگی تو حسنِ عمل سے بنتی ہے۔ طبعی سانس لینے سے عمر بنتی ہے، زندگی نہیں۔ اچھی خوراک اچھی دوائیاں کھانے سے عمر بڑھتی ہے، زندگی نہیں بڑھتی۔ زندگی یا ذاتِ انسانی اعمالِ صالحہ سے بالیدگی حاصل کرتی ہے۔ عمر خواہ کتنی بھی لمبی ہو جائے زندگی کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ زندگی کا وقت تو اتنا ہی شمار ہوگا جو زندہ انسان کی حسنات پر مشتمل ہوگا۔ سیئات یا تضیعِ اوقات عمر کو تو قبول ہو جاتا ہے مگر زندگی وقت کا ایک لمحہ بھی گنوانا نہیں چاہتی۔ عمر آرام و آسائش کی طالب رہتی ہے۔ تن آسانی اور تساہل پسندی اس کی خاصیت ہوتی ہے جبکہ زندگی محنت اور مشقت کی تصویر ہوتی ہے۔ جدوجہد کی آئینہ دار حسنات میں آگے بڑھتے چلے جانے کی طلب گار۔ صرف عمر کے تقاضے پورے کرنے سے زندگی کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ عمر کے تقاضے جسم کی پرورش سے پورے ہوتے ہیں۔ یہ پرورش ضروری ہے لیکن اس بلند مقصد کے لیے کہ انسانی زندگی ارفع ہوتی چلی جائے۔ زندگی جو انسانی ذات سے عبارت ہے۔ اس ذات کی نشوونما کا طریق یہ ہے کہ جس قدر تم منفعتِ انسانی کے کام کرتے چلے جاؤ گے اتنی ہی تمہاری ذات کے اندر پختگی پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ یہ کتابِ مبین قرآن حکیم کا عطا کردہ ابدی اصول ہے۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا ضابطہ حیات بھی غیر متبدل کتابِ مبین ہے۔ جس کے اصول و اقدار اختیار کرنے سے زندگی میں توانائی و حرارت پیدا ہوتی ہے۔ جو کام کرنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ کام یا عمل زندہ انسان کی علامت ہے۔ ایسی واضح علامت ہے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ اور جو انسان حسنِ عمل سے تہی دامن ہے قرآن اس کا شمار زندہ انسانوں میں نہیں کرتا اس کے نزدیک ایسے انسان کی زندگی محض حیوانی سطح کی ہوتی ہے۔ یعنی پیدا ہوئے، کھایا پیا، جسم کی پرورش ہوئی بچے پیدا کیے اور سانس پورے ہونے تک مر گئے۔ عمر گذار لی۔ برعکس اس کے قرآن، زندہ انسان اسے بتاتا ہے، جس کی انسانی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ وہ صلاحیتیں اسے اعمالِ صالحہ کا حامل بناتی ہیں جن کی بدولت اس دنیا میں بھی اس کی زندگی خوشگوار بسر ہوتی ہے اور اسی حسن کارانہ انداز کے ساتھ وہ آخرت کی دنیا کے لئے بھی ہمہ تیار رہتا ہے۔

اس فرمانِ ربی کے مطابق قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۶/۱۶۲) "بیشک میرا جینا بھی خدا (کے مشن کی تکمیل) کے لیے ہے اور مرنا بھی اسی مقصد کی خاطر ہے"

اس لیے اللہ کی کتاب ایمان لانے والوں کو تاکید کرتی ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ (۸/۲۴) "اے جماعت مومنین! اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں اس چیز کی طرف بلاتا ہے جو تمہیں زندگی عطا کر دے۔" اور انسانی سطح کی زندگی ہدایتِ خداوندی (وحی) کی روشنی میں چلنے سے ملتی ہے۔ "وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ (۶/۱۲۲)"

انسان کی ذات کی نشوونما ان قوانین و اقدار کی اطاعت کے ذریعے ہی ممکن ہے جو خدا نے وحی کے ذریعے عطا کی ہیں۔ اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ انسانی ذات کی نشوونما قرآنی پروگرام کا مقصود و منتہیٰ ہے۔ انسان کی تخلیق سے مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی عمر کے محدود وقت میں ایک بہترین زندگی تشکیل دے۔ وہ زندگی جو وحی خداوندی (قرآن حکیم) کے تابع رہ کر نوع انسانی کی بہتری کے لیے وقف ہو۔ جو انسانیت کے فروغ میں اپنا حصہ ادا کرتی ہے۔ کہ اس طبعی عمر میں زندگی اسی حصہ کا نام ہے جو شرفِ انسانی کی سطح پر کسی بلند مقصد کے لیے بسر کی جائے۔ پس تو ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ ہماری "عمر" میں زندگی کا کتنا حصہ ہے۔ جیسے ہماری عمر کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا۔ ہماری اس زندگی یعنی ہماری ذات کو کتنی نشوونما حاصل ہوئی ہے۔ ہمارے اعمالِ حسنہ کا پلڑا بھاری ہے یا نہیں۔ ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان محض نظری ہے یا ہم غور و فکر کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے تمام اعمال کے نتائج ہمارے سامنے آجائیں گے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶) "ہر فرد کا اچھا کام ہو یا برا اس کا نتیجہ سامنے آکر رہے گا۔" یہی اعمال ہماری ذات کے ساتھ آگے جائیں گے۔ عمر بھر کے عزیز دوست رفیقوں میں سے کسی کو ساتھ دیتا ہے نہ مال و دولت نے ہر قدم پر عمل اور صرف حسنِ عمل ہماری زندگی کا سچا ساتھی بنتا ہے۔ یہ آتے جاتے سانس تو نہیں جو ہم بلا شعور، بلا ارادہ ہر وقت لیے چلے جاتے ہیں یہ تو ہماری عمر کو گھٹاتے بڑھاتے ہیں۔ یہ ہماری زندگی ہماری ذات پر غالب نہیں آ سکتے۔ اقبال نے یونہی تو نہیں کہہ دیا تھا سے

از مرگ ترسی اے زندۂ جاوید؟ — مرگ است صیدے تو در کمینی
جانے کہ بخشند دیگر نگیرند — آدم بمیرد از بے یقینی

انسانی عمر کے مقابلے میں انسانی زندگی بلاشبہ فضیلت رکھتی ہے اگر وہ اپنی ذمہ داریاں اور فرائض اقدار و قوانین قرآنی کے مطابق انجام دیتی رہے۔ اس لحاظ سے 'زندگی' کے چند لمحات 'عمر' کے سالوں پر بھاری ہوتے ہیں کسی شاعر نے کس سادہ انداز میں زندگی اور عمر کا لطیف فرق بیان کیا ہے۔

جی لیا چار دن جوانی میں — زندگی عمر بھر نہیں ہوتی

زندگی کی عمر پر اس واضح فوقیت کے باوجود ہماری کیفیت کیا ہے؟ ہم جو صرف انسان ہی نہیں مسلمان بھی ہیں اور اس پر نازاں بھی ہیں۔ کیا ہم اپنی زندگی کو جس کا تعلق ہماری ذات سے ہے اپنی عمر سے جو ہمارے جسم سے وابستہ ہے، زیادہ عزیز رکھتے ہیں یا زیادہ اہم سمجھتے ہیں! کبھی ہم نے اس حوالے سے اپنا احتساب کیا؟ اگر بولنے کی ہم میں جرأت ہو تو ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہم بہر حال اپنی عمر کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ ہمیں اپنی یہ سانسیں عزیز ترین جن کے سہارے ہمارا جسم کھڑا ہے۔ پھر ہم صرف اس جسم کی حفاظت اور اس کی ناز برداری کی خاطر کیا کیا جتن نہیں کرتے۔ اس کے آرام و آسائش کے لیے ساری مادی نعمتیں اپنے دامن میں سمیٹ

لینا چاہتے ہیں۔ اور بیش پا مفادات کا حصول کسی اصول کا پابند نہیں ہوتا۔ اس نظریۂ حیات کے سامنے حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں تفریق و امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یوں اس پیاری عمر کی حفاظت کے ساتھ بے ایمانی اور بددیانتی کی حفاظت بھی جاری رہتی ہے اور یہ حرص بھی بڑھتی جاتی ہے کہ کاش یہ عمر کبھی ختم نہ ہو۔ جبکہ سانس جیسی ناپائیدار شے بھی کوئی دوسری نہیں۔ یہ تو زندگی ہے جو اپنی مضمر صلاحیتوں کو ابھار اور نکھار کر درجہ بدرجہ ارتقائی منازل طے کرتی چلی جاتی ہے اور اس کا بال بیکا نہیں ہوتا۔

عمر خواہشاتِ نفسانی کے محور کے گرد ہی گھومتی رہتی ہے۔ اور اسی بے بسی میں ڈھے جاتی ہے۔ جبکہ زندگی کو ان پستیوں سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ جد وجہد کا راستہ اپناتی ہے۔ اس صراطِ مستقیم کا جو انسانی زندگی کو رواں دواں آگے لیے جاتی ہے۔ عمر موت سے خوف کھاتی ہے۔ اس کے احساس سے کانپ کانپ اٹھتی ہے۔ اور زندگی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے زیر کرتی ہوئی آخری منزل کی جانب چل دیتی ہے۔ بلاشبہ عمر کی ضرورت اپنی جگہ مسلّم ہے ہم اس سے منکر نہیں ہو سکتے۔ لیکن عمر اور زندگی کا تقابل کرتے ہوئے نکتہ سمجھنے کا یہ ہے کہ عمر انسانی سطح پر جینے کے لیے یعنی زندگی کی برومندی کے لیے عطا ہوئی ہے حیوانی سطح پر جینے اور کھا پی کر مرجانے کے لیے نہیں۔

مومن کی زندگی مسلسل جہاد کی زندگی ہے اور قرآنی سطح پر زندگی کا تعین تو ہم حضور نبی اکرمؐ کے اس مختصر سے ارشادِ گرامی سے کر سکتے ہیں۔ جو ہیرے کی طرح جگمگاتا دکھائی دیتا ہے۔

آپ سے پوچھا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے ؟ فرمایا "جب جہاد ہو رہا ہو تو اس میں شریک ہو جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو"۔ ——— کیا یوں مومن یا مسلمان کی ساری عمر زندگی میں تبدیل نہیں ہو جاتی! حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کی "عمر" کا جتنا حصہ "زندگی" ہو گا وہ اُسی قدر زندہ ہو گا ——— یہ ہمارا ایمان ہونا چاہیئے ——— ایمان با عمل ———

اس لیئے کہ:۔

خدائے زندہ ، زندوں کا خدا ہے

خریدار صاحبان متوجّہ ہوں !

خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں

پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہِ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔

حقائق و عبر

۱- سیرت النبیؐ اور پیٹ کا مسئلہ

محترم پرویزؒ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے علماء کا سب سے بڑا مسئلہ پیٹ کا مسئلہ ہے۔ اگر یہ حل کر دیا جائے تو امّتِ مسلمہ کے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے اور مسلمانوں میں سے فرقہ بازی ختم ہو جائے گی۔ مولوی صاحب تو محترم پرویز صاحب کے اس تجزیے پر ناک بھوں چڑھاتے تھے لیکن چونکہ یہ ایک تلخ حقیقت تھی۔ اسلئے کسی نہ کسی حوالے سے اسے تسلیم کرنے پر مجبور بھی تھے۔

حال ہی میں حکومت پاکستان کے زیر انتظام گیارھویں قومی سیرت کانفرس اسلام آباد میں منعقد ہوئی اس میں پاکستان بھر کے سرکردہ علماء نے شرکت کی کانفرس کے کمرے میں تو یہ حضرات رسول اللہؐ کی سیرت کا یہ پہلو اُجاگر کرتے رہے کہ انہوں نے کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھایا تھا لیکن کانفرنس کے کمرے سے نکلتے ہی وہ کھانے کی میزوں پر جس طرح ٹوٹ پڑتے تھے، اسے فرقۂ اہلِ حدیث کے ترجمان ہفت روزہ الاعتصام کے ایڈیٹر جو اس موقع پر موجود تھے، نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

> "اجلاس میں بلاشبہ نہایت متانت اور عالمانہ وقار کا مظاہرہ کیا گیا مگر کھانے کے ہال میں تمام لوگ اس بے صبری اور خود غرضی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ جوان لوگوں کے مقام سے فروتر تھا جن میزوں پر کھانا رکھا گیا تھا ان کے گرد وہی ہجوم ہو جاتا تھا جیسے شادیوں میں شہر و دیہات سے آئے ہوئے بھانوں کا ہوا کرتا ہے۔ وہاں بھی دراز دست لوگ ہی سبقت لے جاتے رہے۔ خواہ ان کا تعلق علماء کے گروہ سے تھا یا دانش وروں کے زمرے سے۔ کوتاہ دستی وہاں بھی محرومی کا باعث ہی رہی"
>
> (ہفت روزہ الاعتصام بابت ۲۰ نومبر ۱۹۸۷ء صـ۳)

۲- خطبۂ حجۃ الوداع

طلوع اسلام بابت جون ۱۹۸۷ء میں ایک مضمون شائع کیا گیا تھا جس میں خطبہ حجۃ الوداع کے اہم

یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ اس کا کون سا متن صحیح ہے۔ حدیث کی سب سے زیادہ صحیح کتاب یعنی بخاری میں یہ خطبہ صرف ایک پیرے پر مشتمل ہے۔ جبکہ حدیث کی دوسری کتابوں میں چند مزید سطروں کا اضافہ ہے لیکن اس کے برعکس ہمارے ہاں جو خطبہ مروّج ہے وہ کئی صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے بارے میں کوئی سند پیش نہیں کی جاتی۔ یہ خطبہ ایک لاکھ سے زائد صحابہ کرام کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس خطبہ کے بارے میں حدیث کے راویوں کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ راویوں کی اس کثرت کے باوجود اس حدیث کا صحیح متن معلوم نہیں ہو سکا۔ تو دو تین راویوں والی احادیث کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔

اس مضمون سے فرقۂ اہلِ حدیث میں کھلبلی مچ گئی لیکن چونکہ ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لئے وہ اس کا جواب دینے کی بجائے پرویز صاحب پر کیچڑ اچھالنے میں مصروف ہو گئے۔ اہلِ حدیث [illegible] کا ایک ماہنامہ ایسی کوشش کرتے ہوئے یہ غلط بیان کرتا ہے۔

"ابھی پچھلے ہی دنوں "طلوعِ اسلام" نے خطبۂ حجۃ الوداع کی روایات کو قرآنی تعلیمات کے خلاف سمجھ کر ان کا مذاق اڑایا تھا۔

(ماہنامہ محدث بابت نومبر ۱۹۸۷ء صفحہ ۱۶۵)

حاشا وکلا طلوعِ اسلام نے اس خطبے کا کوئی مذاق نہیں اڑایا تھا۔ ان حضرات سے صرف یہ دریافت کیا تھا کہ ایک لاکھ سے زائد راویوں والی حدیث کا صحیح متن کیا ہے۔ اگر ان حضرات میں کوئی علمی دیانت ہے تو ڈیڑھ [illegible]سال گذر جانے کے بعد بھی اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔

فرقۂ اہلِ حدیث اور مسئلہ قربانی

محترم پرویز صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ قرآن مجید سے قربانی کا ثبوت نہیں ملتا۔ جبکہ اہلِ حدیث علماء کا یہ [illegible]ہے کہ یہ قرآن مجید سے ثابت ہے۔ اس بارے میں وہ موصوف کے دلائل کا رد ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"قربانی کا ثبوت سورۂ کوثر کی دوسری آیت سے بھی ملتا ہے" پرویز صاحب اسکی تردید میں فرماتے ہیں۔

حالانکہ "وانحر" کا معنی ——— "علمی طور پر کسی معاملے پر حاوی ہو جانا" ——— صرف اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس کا کوئی قرینہ پایا جاتا ہو۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ "نحر الامور علماً" ——— تو لفظ "علماً" کا قرینہ اس معنی کا مؤید ہو گا کہ ——— "اس نے معاملات کو مضبوط طریقے

سے کیا تھا ___ جو مثال پرویز صاحب نے دی ہے اس میں فی الواقعہ ایسا قرینہ موجود ہے جو یہ معنی مراد لینے کے حق میں ہے۔ لیکن سورۃ الکوثر میں سرے سے ایسا قرینہ موجود ہی نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں یہ معنی کسی طرح بھی مراد نہیں لیے جا سکتے۔ "نحر" کو مطلق رکھتے ہوئے اگر "نحر فلان" کہا جائے تو ہر عرب اس سے یہی سمجھے گا کہ "فلاں نے (اونٹ کی) قربانی کی ہے"۔ نہ یہ کہ وہ عقل و تجربہ اور بصیرت و مشاہدہ سے کسی معاملے میں حاوی ہو گیا ہے ___ بہر حال پرویز صاحب "مروجہ ترجمہ" کے بعد اپنا خود ساختہ "ماڈرن ترجمہ" پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:-

" یہ ہے ہماری بصیرت کی رُو سے اس سورہ میں وانحر کا مفہوم، اس سے مروجہ قربانی کی سند لینا بعید از کار سی بات ہے۔" (مطالب القرآن جلد ۳ ص ۲۴۹)

اگر ان حضرات کا استدلال صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر قربانی فرض قرار پاتی ہے۔ لیکن انہی کے فرقے کے ایک امام ابن حزم کی تحقیق کے مطابق صحابہ کرام قربانی کو نہ صرف یہ کہ غیر ضروری سمجھتے تھے، بلکہ وہ استطاعت کے باوجود قربانی نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے صحابہ کرام کا عمل نقل کرنے کے بعد کہ وہ استطاعت کے باوجود قربانی نہیں کرتے تھے، علامہ ابن حزم یہ ثابت کرتے ہیں:-

(ترجمہ) قربانی کا وجوب کسی صحابی سے ثابت نہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ قربانی واجب نہیں ہے اور حضرت سعید بن المسیب اور الشعبی سے بھی یہی روایات ہے اور انہوں نے فرمایا کہ قربانی کی بجائے تین درہم خیرات کر دینا، ان کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔" (المحلی لابن حزم جلد ۷ صفحہ ۳۵۸)

فرقہ اہل حدیث کے اس دعوے سے تو یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ نعوذ باللہ صحابہ کرام کو بھی قرآن کی سمجھ نہیں تھی۔ یہ حضرات امام ابن حزم کی اس کتاب یعنی المحلی کا اردو ترجمہ بھی شائع کرتے ہیں، کاش وہ اسے کبھی پڑھ بھی لیتے۔

۴۔ علمائے اہل حدیث کی حق پرستی؟

اہل حدیث علماء کا یہ متفقہ فتویٰ ہے کہ شریعت اسلامی میں فوٹو حرام ہے کیونکہ اس سے غیر اللہ کی عقیدت قائم ہوتی ہے جو شرک ہے اور شرک اسلام میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ لیکن اس بارے میں خود ان کا اپنا طرز عمل افسوسناک ہے حال ہی میں ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو جمعیت اہل حدیث کا موچی دروازے میں ایک عظیم جلسہ عام اس جلسے میں نہ صرف یہ کہ ان کے ایک لیڈر علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم کی قد آدم تصاویر آویزاں تھیں بلکہ ان

جلسہ میں فروخت بھی کیا جا رہا تھا۔ تصاویر کا بنڈل سٹیج کے پاس ہی پڑا تھا۔ بعض لوگوں نے اہلِ حدیث علماء کی اس جہالت کی طرف توجہ بھی دلائی تو پھر بھی تصاویر کی فروخت کو بند نہ کیا گیا۔ بعد میں ان حضرات نے اس واقعہ پر مندرجہ ذیل معمولی سا تبصرہ کر کے اس حرام کے ارتکاب پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی۔

بعض دولت کے پجاریوں نے علامہ شہیدؒ کی تصویر کو دیدہ زیب انداز سے شائع کر کے ان کو عام فروخت کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ فعل اگرچہ کسی پرلے درجہ کے دنیادار فردِ واحد ہی کا ہے۔ تاہم جلسوں میں اس کے فروخت کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے تاکہ فردِ واحد کی روسیاہی سے جماعت کی رسوائی و روسیاہی کا سامان نہ ہو۔ اس کے لیے چند رضاکاروں کی ڈیوٹی ہی صرف یہ لگائی جا سکتی ہے کہ وہ اس پر کڑی نظر رکھیں اور کسی بھی عبدالدینار والدرہم کو تصویر فروشی کی اجازت نہ دیں۔"

(ہفت روزہ تنظیم اہلِ حدیث بابت ۱۳ نومبر ۱۹۸۷ء ص ۴)

نابالغ کا نکاح

قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق نکاح میاں بیوی کے درمیان ایک معاہدہ ہے (سورۃ النساء ۲۱) اور معاہدہ بالغ افراد کے درمیان ہی ہو سکتا ہے۔ تاہم بعض فقہاء قرآن مجید کے اس واضح حکم کے خلاف فتویٰ دے کر لڑکی سے نکاح کو جائز قرار دیتے رہے ہیں۔ لیکن ایسے نکاحوں کی وجہ سے معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کے سدِباب کے لیے نابالغی کا نکاح پاکستان سمیت ساری اسلامی دنیا میں خلافِ قانون دیا جا چکا ہے لیکن اہلِ حدیث علماء کو اتنے بڑے واقعہ کا علم تک نہیں اور وہ ابھی تک ایسے نکاح کے جواز کے فتوے جاری کر رہے ہیں۔ حال ہی میں ان کے سب سے سنجیدہ ہفت روزہ کی ۴ دسمبر ۱۹۸۷ کی اشاعت میں یہ فتویٰ شائع ہوا ہے۔

"صورتِ مسئولہ: ان احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق مسمات امیراں بی بی دختر اللہ دتہ ساکن چک ۲ محمد والا ضلع فیصل آباد اگر سرے سے اپنے شوہر محمد اصغر ولد وساکھو کھر کے ہاں بعد آباد نہیں ہوئی تو خیار بلوغ کا حق استعمال کر سکتی ہے تاہم فسخ نکاح ثوثیق افسر مجاز سے ضروری ہے کسی قانونی سقم کا ہرگز ذمہ دار نہ ہوگا۔ اگر ایک آدھ دفعہ آباد ہو چکی ہے۔ تو پھر بعد کی ناپسندیدگی سے حق خیار بلوغ کرتے ہوئے نکاح فسخ نہیں کر سکتی۔"

(ہفت روزہ الاعتصام بابت ۴ دسمبر ۱۹۸۷ء ص ۹)

... کی دیانت ملاحظہ ہو کہ اس مقصد کے لیے جو احادیث پیش کی ہیں۔ ان میں کہیں بھی صغر سنی کی شادی

کا ذکر نہیں۔ اگر اہلِ حدیث کے سب سے سنجیدہ اخبار کا یہ معیارِ دیانت ہے تو اس فرقے کے دوسرے اور تیسرے درجے کے اخبارات اور رسائل سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

۶۔ بلاتبصرہ

لادین سیاسی جدوجہد

- پاکستان کی مذہبی جماعتوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ملک میں اس وقت ایک طاغوتی نظام نافذ ہے۔
- اس پر بھی وہ متفق ہیں کہ یہاں خدا کی حاکمیت اور شریعت مصطفےٰ پر مبنی نظام قائم ہو۔

مگر

یہ سب کی سب مذہبی سیاسی پارٹیاں، مغربی جمہوریت کے کافرانہ سیاسی نظام کو تسلیم کرتے ہوئے اسی نظام کی بحالی کے لیے شب و روز مصروفِ عمل بھی ہیں اور یہ بھی چاہتی ہیں کہ ملک میں اس کافرانہ نظام کے داعیوں اور کارندوں کے ذریعے نظام مصطفےٰ بھی قائم ہو۔ اسی مقصد کی خاطر لادین سیاسی پارٹیوں کے ساتھ کبھی اتحاد کر کے اور کبھی ہمنوا بن کر، اُسی طاغوتی نظام کی اسمبلیوں میں شریک ہو کر مغرب کے لادینی نظام کو مستحکم بنایا جا رہا ہے۔ کیا اب بھی اس امر میں کوئی شبہ باقی رہ گیا ہے کہ ان مذہبی پارٹیوں کی یہ سیاسی جدوجہد "لادین سیاسی جدوجہد" کے زمرے میں آتی ہے۔

(ماہنامہ مسلم کراچی بابت ربیع الاول صفحہ اوّل)

۷۔ کتاب و سنّت

جب سے فرقہ اہلِ حدیث وجود میں آیا ہے۔ اس کے علماء یہ اعلان کر رہے ہیں کہ ان کے نزدیک شریعت اسلامیہ سے مراد کتاب و سنّت ہے۔ حال ہی میں ان کے ایک بہت بڑے عالم نے اس دعوے کا ان الفاظ میں اعادہ کیا ہے۔

اہلحدیث کے نزدیک کتاب و سنّت ہی شریعت ہے

مولانا حضرت عبدالقادر روپڑی کے زیرِ صدارت اہلِ حدیث علماء کے ایک اجتماع میں شریعت بل کی موجو

موجودہ صورت حال پر غور کیا گیا۔ جس میں واضح کیا گیا کہ برصغیر میں اہل حدیث کی تحریک کا مقصد خالص کتاب وسنت کی دعوت ہے۔ ملکی سطح پر بھی جب نفاذ شریعت کا سوال اٹھا تو اہل حدیث نے کتاب و سنت کی تنفیذ کے لیے بھرپور کوشش کی کیونکہ مسلمانوں کی موجودہ فرقہ بندی میں کتاب وسنت ہی وہ واحد اساس ہے جس پر سب مسلمان جمع ہو سکتے ہیں۔ اہل حدیث اپنے اس موقف سے ہٹ کر کسی مصالحت پر تیار نہیں جس کے لیے وہ کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

(ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث بابت ۶ نومبر ۱۹۸۷ صـ ۱۷)

محترم پرویز صاحب ان حضرات سے ان کے اس دعوے کے سلسلے میں استفسار کرتے رہے کہ کتاب کے بارے میں تو ہر مسلمان کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں کہ سنت سے مراد کون سی کتاب ہے۔ ان کے اس استفسار کا واضح جواب دینے کی بجائے یہ کہہ دیا جاتا کہ سنت احادیث کی کتابوں میں ہے۔ اب احادیث کی پوری سنتالیس کتابیں ہیں۔ جن کی ہزاروں احادیث خود ان حضرات کے نزدیک ضعیف ہیں۔ ہر فرقہ اپنے مطلب کی احادیث کو سنت قرار دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں میں فرقوں کی بنیاد پڑی۔ ان احادیث کو صحیح تسلیم کرنے کا کوئی معیار نہیں۔ خود اہل حدیث حضرات ان مجموعوں کی ایسی صحیح ترین احادیث کا انکار کرتے ہیں۔ جن سے ان کے مالی مفادات پر زد پڑتی ہے۔ ہمارا اشارہ بٹائی کو حرام قرار دینے والی احادیث کے بارے میں ہے۔ جن میں رسول اللہ صلعم نے اس معاملے کو اپنی زبان مبارک سے سود قرار دیا۔ زمانۂ جدید کے سب سے بڑے ماہر معاشیات لارڈ کینز بھی اس معاملے کو سود قرار دیتے ہیں۔ جدید علمی تحقیق سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے لیکن چونکہ ان احادیث کا پیٹ کے مسئلہ سے تعلق ہے۔ اس لئے اہل حدیث حضرات ان سب سے صحیح احادیث کو تسلیم نہیں کرتے اور سود جیسے حرام معاملے کو جائز قرار دیتے ہیں۔

۸۔ حضرت اور اعلیٰ حضرت

حال ہی میں ایک رئیس مستشرق نے ہم سے دریافت کیا ہے کہ مسلمان رسول اللہؐ کے اسم مبارک کے ساتھ تو حضرت لکھتے ہیں۔ لیکن بعض علماء کے نام کے ساتھ اعلیٰ حضرت لکھتے ہیں۔ اور بولتے ہیں تو کیا یہ "اعلیٰ حضرت" حضرت سے کوئی کم اعزاز ہے یا ان کے علماء کا مرتبہ رسول اللہ صلعم سے بلند ہے۔

یہ سوال خود ان لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنا چاہیئے تھا جو اس حرکت کا ارتکاب کرتے ہیں انہیں سوچنا چاہیئے کہ اسطرح اپنے علماء کے ساتھ "اعلیٰ حضرت" لکھ کر وہ رسول اللہ صلعم کی توہین کے مرتکب تو نہیں ہو رہے؟